© rasailojaraid.com

دے کر شہید کرنا اور حق خودارادی کو پامال کرتے ہوئے کشمیر، فلسطین، چیچنیا اور عراق میں امریکہ کی ریاستی دہشت گردی اور جارحیت کا اندھادھند نفاذ۔ جب تک اس صورت حال کو تبدیل نہیں کیا جائے گا شدت پسندی میں اضافہ ہی ہوگا۔

یہ بات پاکستان کے حکمران طبقہ کو سمجھ لینی چاہیے کہ اگر سرکاری تعلیمی اداروں کے نصاب سے دینی عنصر کو خارج کیا گیا اور اس کی جگہ لادینی تصورات کو متعارف کرایا گیا تو اس طرح جو فکری اور اخلاقی خلاء پیدا ہوگا وہ لازماً معاشرہ میں شدت پسندی میں اضافہ کا باعث بنے گا۔ اسی طرح اگر دینی مدارس کے نصاب میں جہاد، امر بالمعروف، اور اعلائے کلمۃ الحق سے متعلق قرآنی آیات واحادیث کو خارج کر بھی دیا جائے تو مسئلہ حل نہیں ہوگا کیونکہ قرآن وسنت سے امت مسلمہ کا تعلق صرف دینی مدارس کے طلبہ کی حد تک نہیں ہے۔ اس عظیم کتاب کا کم ازکم ایک نسخہ ہر گھر میں پایا جاتا ہے اور اگر اس کتاب ہدایت کو اس کے صحیح مفہوم ومدعا کے ساتھ سرکاری، غیر سرکاری اداروں میں نہ پڑھایا گیا تو نیم عالم حضرات جس طرح چاہیں گے عوام الناس کو اس کی آیات کے حوالے سے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے رہیں گے۔ اس لیے قرآن کریم کی تمام تعلیمات بشمول جہاد اور اعلائے کلمۃ الحق ودعوت ونصیحت کی تدریس ہی مسئلہ کا حل کر سکتی ہے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ عربوں کے قبائلی عناد، دشمنی اور عصبیت جاہلیہ کا علاج اگر کوئی نسخہ کر سکا تو وہ صرف قرآن وسنت کی تعلیمات ہی تھیں۔ آج بھی امت مسلمہ کا تعلق قرآن سے جتنا قریب ہوگا اس میں اخوت، محبت، تعاون، امن اور صلح کی صفات اسی قدر زیادہ پیدا ہوں گی۔

ملکی مفاد اور سلامتی کے نفاذ کا تقاضا ہے کہ نہ صرف دینی مدارس بلکہ سرکاری اور پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں بھی لازمی قرآنی تعلیم کو متعارف کیا جائے تاکہ لادینیت، عصبیت اور جاہل قومیت کی جگہ ہم ایک بامقصد، باوقار اور متوازن وعادل معاشرہ کی تعمیر کر سکیں۔ یہی بانی پاکستان قائداعظم کا تصورِ پاکستان تھا اور اسی مقصد کے لیے علامہ اقبال نے اپنی فکر اور شعر کے ایک ایک لفظ کو استعمال کیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دینی مدارس میں اصلاحات اور مغربی خدشات*

راشد بخاری

پاکستان اور افغانستان کے دینی مدارس گزشتہ تقریباً تین عشروں سے مغربی پالیسی سازوں، دانشوروں اور محققین کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ اس عرصے میں عالمی سطح پر دو اہم ترین واقعات دینی مدارس کے بارے میں مغربی خصوصاً امریکی پالیسی کی دو نمایاں اور ایک لحاظ سے متضاد کروٹوں کا باعث بنے ہیں۔ ستر کے عشرے کے اواخر میں افغانستان میں روسی جارحیت اور اسّی (۸۰) کے عشرے کے آغاز میں کمیونزم کے پھیلاؤ کو امریکی بلاک کے مغربی ایوانوں میں دنیا کے مستقبل کے لیے ایک بہت بڑے خطرے کے طور پر دیکھا گیا۔

اس خطرے کا مقابلہ کرنے کی حکمت عملی اس طرح سے ترتیب دی گئی کہ کسی طرح خطے (افغانستان اور گرد و نواح) کے دینی مدارس میں زیر تعلیم طلبہ کی نوجوان قوت کو بھی استعمال کیا جا سکے جو روسی حملے کو افغانستان کی خودمختاری اور کمیونزم کو یہاں کے لوگوں کے نظریۂ زندگی کے خلاف یکساں طور پر خطرہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ مغربی پالیسی سازوں نے ان طلباء میں برائی اور شر کے خلاف ڈٹ جانے کے جذبے اور اس کے پیچھے ان کے تصور جہاد کو کمیونزم کے شر کے خلاف ایک مددگار نظریہ سمجھتے ہوئے روسیوں کے خلاف مزاحمت میں مصروف افغانستان کے طالبان کو مدد اور اعانت فراہم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۲۹ اکتوبر ۲۰۰۳ء کو امریکی کانگریس کے لیے تیار کردہ ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے:

---

*اس مضمون کی تیاری میں مدارس کے موضوع پر مغرب میں تیار ہونے والی مختلف رپورٹوں، مضامین اور کتب سے استفادہ کے ساتھ ساتھ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد کے زیر اہتمام ۲۰۰۴ء میں پانچ پالیسی سیمیناروں (منعقدہ اسلام آباد، پشاور، لاہور، کراچی اور کوئٹہ) میں مدارس اور دیگر حکومتی و غیر حکومتی اداروں کے نمائندوں کی گفتگوؤں اور مباحث کو بھی بنیاد بنایا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۹۸۰ء کے عشرے میں افغانستان اور پاکستان کے مدرسوں کو امریکہ، یورپی حکومتوں اور سعودی عرب کی طرف سے مالی امداد کے ذریعے فروغ دیا گیا جو ان سب مدرسوں کو سوویت مخالف مجاہدین کے بھرتی کے میدانوں (ریکروٹنگ گراؤنڈز) کے طور پر دیکھ رہے تھے[۱]۔

یقیناً یہ محض مالی امداد نہیں تھی بلکہ فوجی کمک، تربیت، ہتھیاروں کی فراہمی اور سٹریٹیجک امداد بھی اس میں شامل تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مجاہدین کی افرادی قوت میں اضافے کے لیے نظریہ جہاد کے فروغ کے لیے کوششیں کی گئی۔ اس مقصد کے لیے حتیٰ کہ مدارس کی درسی کتب اور جہادی لٹریچر کی تیاری کا کام بڑے پیمانے پر امریکہ میں شروع کیا گیا۔ امریکی امدادی ادارے یو ایس ایڈ (U S AID) نے ۱۹۸۴ء سے ۱۹۹۴ء کے دوران یونیورسٹی آف نبراسکا کو اس مقصد کے لیے ۵۱ ملین امریکی ڈالر کی گرانٹ دی تھی جہاں مرکز برائے مطالعات افغانستان نے افغانستان پر امریکی ماہرین اور سوویت مخالف افغان ماہرین تعلیم کی مدد سے یہ لٹریچر تیار کیا[۲]۔

دوسرا اہم ترین واقعہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکی شہر نیویارک میں عالمی تجارتی مراکز کی تباہی کی صورت میں پیش آیا۔ اس واقعہ کو دوسری جنگ عظیم میں پرل ہاربر کے واقعہ سے بھی بڑھ کر امریکی تاریخ میں سب سے خوفناک دہشت گردی قرار دیا گیا۔ اس کی ذمہ داری اسامہ بن لادن اور ان کی تنظیم القاعدہ پر ڈالی گئی جنہوں نے کچھ عرصہ قبل امریکہ اور مغربی ممالک کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری کیا تھا اور جو سعودی عرب میں مقامات مقدسہ سے امریکی فوج کے انخلاء اور مسلم ممالک میں امریکی اور مغربی مداخلت ختم کرنے اور خصوصاً عراق کے حوالے سے مسلمانوں کے خلاف ترجیحی امریکی سلوک بند کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور ایسی تمام طاغوتی قوتوں کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے ہیں جو مسلمان ممالک کو کسی بھی حوالے سے نشانہ بناتی ہیں۔

بہ ایں سبب اس وقت دنیا بھر میں جاری دہشت گردی کے واقعات کو مذہبی پس منظر میں دیکھا جانے لگا ہے اور بنیادی طور پر مسلمانوں خصوصاً ان کے تصورِ جہاد کو دنیا میں بڑھتی ہوئی امریکہ/مغرب دشمنی[۳] کا ذمہ دار ٹھہرایا جانے لگا ہے۔ اس تصور کے فروغ کے اسباب پر نظر ڈالی گئی تو مسلم ممالک کے دینی مدارس کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا[۴] جن کا بنیادی مقصد ہی مذہبی تعلیم کا فروغ اور اسلامی اقدار و روایات کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تحفظ ہے۔ چنانچہ اسلامی تعلیمی روایت کے علم برداران قدیم ترین اداروں کو موجودہ صدی میں دہشت گردی کے فروغ کے ادارے قرار دیتے ہوئے، افغانستان پر ۷ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو امریکی حملے کے ساتھ ہی شروع ہونے والی دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کے اہداف اس طرح سے طے کیے گئے کہ ایک مرحلے میں براہ راست فوجی کارروائی کے ذریعے تمام اسلامی عسکریت پسندوں اور جہادی تنظیموں کا خاتمہ کر دیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ مسلم ممالک پر دباؤ، ترغیب اور دھمکی کے ذریعے ان تمام مدارس کو بند کرایا جائے جہاں مغرب دشمنی اور عسکریت کی تعلیم دی جاتی ہے اور جہاں نوجوان طلبہ کی برین واشنگ کر کے انھیں 'جہاد' کے لیے تیار کیا جاتا ہے!![۶]۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے کینیڈی سکول آف گورنمنٹ کی ایک استاد جیسیکا سٹرن کے مطابق:

> امریکہ نے پاکستان کو کہا ہے کہ وہ عسکری گروہوں کے خلاف کارروائی کرے اور مخصوص مدرسوں کو بند کرے۔ مگر امریکہ کو اس زبانی ڈانٹ ڈپٹ سے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ [کیونکہ] بہرحال امریکہ نے سعودی عرب سے مل کر افغان جنگ کے دوران سوویت یونین کے خلاف لڑنے کے لیے پہلا بین الاقوامی جہاد شروع کرنے میں مدد کی تھی[۷]۔

تعلیمی اصلاحات میں امریکی دلچسپی

مسلم دنیا کے طول و عرض میں پھیلے ان بے شمار مدارس کو یکسر ختم کرنا محال ہے، اس لیے دوسرے مرحلے میں مدارس میں ایسی اصلاحات پر زور دیا گیا جن سے یہاں پر تعلیم و تدریس کا انداز مذہبی اور انتہا پسندانہ نہ رہے بلکہ جدید، لبرل اور سیکولرائز ہو جائے اور نتیجتاً امریکہ اور مغرب دشمنی کے خطرے کو ٹالا جا سکے۔

مدارس اور انتہا پسند اسلامی گروہوں کے درمیان تعلق کے اندیشے کو مغرب میں نہایت تشویش کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے تاہم وہاں یہ ادراک بھی پایا جاتا ہے کہ عام طور پر یہ تصورات سطحی تجزیے اور بغیر گہری چھان بین کیے اخذ کیے گئے نتائج کے سبب زیادہ تیزی سے پھیلے ہیں، جبکہ یہ معاملہ کہیں زیادہ پیچیدہ ہے اور تمام حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے گہرے تجزیے کا متقاضی ہے۔ انٹرنیشنل کرائسس گروپ کی ایک رپورٹ کے مطابق ''تشدد اور تنازعات میں مدارس کا ایک کردار ضرور ہے لیکن وہ اس کے ساتھ ساتھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پاکستان کی مذہبی اور سماجی زندگی میں ایک کلیدی مقام کے حامل ہیں''[8]۔

مدارس میں اصلاحات کے ضمن میں مجموعی اور وسیع سطح پر یہ سوال سامنے آیا کہ عدم استحکام پیدا کرنے والی انتہاپسندی کو فروغ دیے بغیر اسلامی معاشروں کو جدید بنانے کے لیے کیا اقدامات کیے جاسکتے ہیں؟ اس کا ایک جواب یہ تھا کہ مذہبی نظریے اور مطالبات کے مدمقابل ایک ایسا متبادل نظریہ اور سوچ پیش کی جائے اور اسے ترویج دی جائے جس میں قومی شناخت، روایت اور جدیدیت یکجا ہو جائیں اور جس کے تحت معاشرے میں خدا کی بھی ایک 'جائز' جگہ ہو[9]۔ ان اصلاحات کا مقصد بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ مسلم معاشروں کو اس طرح سے جدید بنایا جائے کہ وہ مغرب اور مغربی نظاموں کے لیے خطرہ نہ رہیں اور مغرب اور مسلمانوں میں ایک ہم آہنگی پیدا ہو کر بالآخر ہم رنگی پر منتج ہو اور اولین مستشرقین کے الفاظ میں تہذیبی مشن (Civilizing Mission) کی تکمیل ہو سکے۔

اصلاح کی اس حکمت عملی کو دو سطحوں پر روبہ عمل لایا گیا۔ اولاً اس بات کو اہمیت دی گئی کہ پاکستان کے سرکاری تعلیمی نظام کو سیکولر بنیادوں پر مضبوط بنانے اور نئے سکولوں کے قیام میں مدد کی جائے اور ثانیاً مدارس میں سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع سے براہ راست اصلاحات کے ذریعے مذہبی انتہاپسندی کے خاتمے کے لیے کوشش کی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ مسلم انتہاپسند گروہوں کو مدارس کی طرف سے کسی بھی طرح کی مالی، انتظامی، افرادی اور نظریاتی کمک کو ناممکن بنا دیا جائے۔ امریکی خارجہ تعلقات کمیٹی کے سامنے امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے ۱۰ مارچ ۲۰۰۴ء کو ایک بیان میں کہا کہ ''پاکستانی مدارس دہشت گردوں کی آماجگاہ ہیں جس کے لیے ہم مشرف اور دیگر اسلامی ممالک کے سربراہوں کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں''۔ اسی طرح امریکی قومی سلامتی کی مشیر کونڈالیزا رائس نے اپنے ایک بیان میں فرمایا کہ ''پاکستان میں تعلیمی نصاب کے پیچھے ہماری ہدایات کارفرما ہیں[10]۔

امریکی امدادی ادارے یو ایس ایڈ کی ایک رپورٹ کے مطابق ''سرکاری تعلیمی نظام کے حمایتیوں کی دلیل ہے کہ موجودہ اسکولوں میں بہتری لانے یا نئے اسکول قائم کرنے سے مذہبی مدارس کا قابل عمل متبادل پیش کیا جاسکتا ہے۔ دوسروں کے خیال میں اصلاحات خود اسلامی مدرسوں میں کرنی چاہییں تا کہ ان مقبول اداروں میں ایک ہمہ جہت نصاب کو یقینی بنایا جاسکے''[11]۔ یو ایس ایڈ کی رپورٹ میں ان دونوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہائے نظر کی وکالت کی گئی ہے۔ تاہم اس رپورٹ میں یہ خدشہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ ''محض معیاری تعلیم تک رسائی ایسے تمام ناپختہ ذہنوں کو دہشت گرد گروہوں میں شامل ہونے سے نہیں روک سکتی''۱۲۔

پاکستان میں تعلیمی اصلاحات کے لیے امریکی امداد

ستمبر ۲۰۰۲ء میں یو ایس ایڈ نے پاکستان میں تعلیمی اصلاحات کے لیے پانچ سالوں میں ۱۰۰ ملین ڈالر مہیا کرنے کی حامی بھری۔ ایک غیر تجارتی امریکی کارپوریشن ''ریسرچ ٹرائینگل انسٹی ٹیوٹ'' (RTI) کو یو ایس ایڈ نے اس امداد میں سے پاکستان میں ایجوکیشن سیکٹر ریفارم اسسٹنس کے پراجیکٹ کے نفاذ کے لیے ۶۰ ملین ڈالر کا کنٹریکٹ دیا ہے۱۳۔ امریکہ نے اس کے لیے ''مڈل ایسٹ پارٹنر شپ انی شی ایٹو'' (MEPI) کے ذریعے مزید مالی وسائل فراہم کرنے کی بھی یقین دہانی کرائی۔ MEPI کا ایک ہدف عرب دنیا میں سیکولرازم کی تعلیم کا فروغ بھی ہے اور اس نے مسلم دنیا میں مدرسوں میں طلبہ کے داخلوں کے بڑھتے ہوئے رجحان پر اپنی تشویش کا اظہار بھی کیا ہے۱۴۔ MEPI کو مالی سال ۲۰۰۲ء میں ۲۹ ملین ڈالر اور مالی سال ۲۰۰۳ء میں ۹۰ ملین ڈالر مل چکے ہیں جبکہ بش انتظامیہ نے MEPI کے لیے ۱۴۵ ملین ڈالر کی درخواست کی۔ مالی مناسبتوں کی ہاؤس کمیٹی نے MEPI کے لیے اور اسلامی دنیا میں جاری پروگراموں (Islamic Outreach) کے لیے سال ۲۰۰۴ء میں ۴۵ ملین ڈالر دینے کی سفارش کی۔ کمیٹی نے تعلیم و تربیت اور تبادلوں کی اہمیت واضح کی اور ساتھ یہ بھی واضح کیا کہ ان فنڈز کو عرب مسلم دنیا اور غیر عرب مسلم دنیا میں مساوی طور پر خرچ کیا جانا چاہیے۱۵۔

مدارس کی اصلاح کے لیے مغربی سفارشات/مطالبات

۱۲ جنوری ۲۰۰۲ء کو پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف نے قوم سے اپنے خطاب میں مدرسوں میں بڑھتی ہوئی انتہاپسندی پر گہری تشویش کا اظہار کیا اور انہیں قومی تعلیمی دھارے میں شامل کرنے کے لیے مدارس میں اصلاحات کے لیے اپنے عزم کا اظہار کیا۔ اس کے فوری بعد مدرسہ آرڈیننس ۲۰۰۲ء جاری کر دیا گیا جس کا بنیادی مقصد مدارس کی رضا کارانہ رجسٹریشن کے ذریعے مدارس کے اعداد و شمار کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درست معلومات حاصل کرنا، مدارس کے نظام کو باقاعدہ بنا کر اسے سرکاری نگرانی میں لانا اور یہاں کے نظام ونصاب میں اصلاحات کے نفاذ کو ممکن بنانا تھا۔ نصاب میں جدید اصلاحات کے لیے مدارس کے ذمہ داران کو قائل کرنے اور ان کے سامنے قدیم وجدید کے امتزاج کی ایک مثال پیش کرنے کے لیے ابتداء میں ملک میں ۳ ماڈل مدرسوں کا قیام بھی اس سے قبل عمل میں لایا جا چکا تھا۔

پرویز مشرف کی حکومت کے ان اقدامات کے محرکات میں داخلی سلامتی اور مذہبی فرقہ واریت کے خاتمہ کے تقاضوں کے علاوہ ایک بڑا محرک مدارس کے حوالے سے مغربی تشویش اور بین الاقوامی دباؤ بھی ہے جس کا اندازہ بین الاقوامی میڈیا کی دلچسپی، خبروں، رپورٹوں، بین الاقوامی اداروں کی تحقیق، تجزیوں اور بین الاقوامی تعلقات اور خارجہ پالیسیوں کے انداز ور حجانات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ ایک مثال کے طور پر ''انٹرنیشنل کرائسس گروپ''[16] کی ایشیا رپورٹ نمبر ۳۶ ''پاکستان: مدرسے، انتہا پسندی اور فوج''[17] کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ رپورٹ دینی مدارس آرڈی ننس ۲۰۰۲ء کے اجراء اور پاکستان مدرسہ بورڈ کے قیام کے بعد ۲۹ جولائی ۲۰۰۲ء کو شائع کی گئی۔ رپورٹ میں اصلاحات کے حکومتی اقدامات کا جائزہ لیتے ہوئے انہیں نیم دلانہ اقدامات قرار دیا گیا اور ان کے نفاذ میں کمزوری پر عدم اطمینان اور تشویش کا اظہار کیا گیا۔ حقیقی اصلاحات اور ان کے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے رپورٹ میں حکومت پاکستان، بین الاقوامی امداد دہندگان (ڈونرز)، برطانیہ، سعودی عرب اور دیگر خلیجی ریاستوں، جی ایٹ ممالک خصوصاً برطانیہ اور امریکہ کے سامنے عملی اقدامات کے سلسلے میں کچھ سفارشات اور مطالبات رکھے گئے۔ اس گروپ کی وسیع بین الاقوامی بنیاد وحیثیت اور مغربی حکومتوں اور اداروں سے اس کے رشتہ وتعلق کی بنا پر ان سفارشات اور مطالبات کو حکومت پاکستان پر مدارس میں اصلاحات کے لیے بین الاقوامی دباؤ کے پس منظر میں سمجھا جانا چاہیے۔ ذیل میں ان سفارشات کا ایک خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے جن سے اصلاحات کی نوعیت اور ان کے مطلوبہ نتائج کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

سفارشات برائے حکومت پاکستان

۱- وزیر داخلہ کی سربراہی میں فوری طور پر ایک مدرسہ ریگولیٹری اتھارٹی قائم کی جائے جو:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الف۔ چھ ماہ میں لازمی رجسٹریشن اور درجہ بندی کے مقاصد سے مدارس کا جامع سروے کرے۔

ب۔نصاب اور مالی اصلاحات کے نفاذ میں پاکستان مدرسہ تعلیمی بورڈ کی مدد کرے۔

ج۔ اصلاحات کے عمل میں شریک مختلف حکومتی محکموں اور اداروں کی کوششوں کو مربوط بنائے۔

د۔علماء، ڈونرز، قانون نافذ کرنے والے اداروں اور بین الاقوامی تنظیموں کے درمیان ایک مرکزی رابطہ کار کے طور پر کام کرے۔

۲-چھ ماہ کے اندر مدارس میں نصابی اصلاحات نافذ کرے جن سے یہ یقینی ہو جائے کہ:

الف۔ووکیشنل ٹریننگ کے پروگرام شامل کر لیے گئے ہیں۔

ب۔نئے تدریسی پروگرام میں جدید مضامین کے لیے زیادہ وقت مختص کیا گیا ہے۔اور

ج۔مدارس کی اسناد کو تسلیم کرنا نئے تدریسی نظام پر عمل درآمد سے مشروط ہے۔

۳-ممنوعہ عسکری تنظیموں کے ساتھ منسلک تمام مدارس کو فوراً بند کر دیا جائے اور ان کے قائدین پر، اگر وہ تشدد کو ابھارنے میں ملوث ہوں تو موجودہ فوجداری قوانین کے تحت مقدمے قائم کیے جائیں۔

۴-رجسٹریشن کے وقت تمام مدارس کو پابند کیا جائے کہ وہ:

الف۔سالانہ آمدن، خرچ اور آڈٹ کی رپورٹیں شائع کریں۔

ب۔اپنے اثاثہ جات اور فنڈنگ کے ذرائع کو منظر عام پر لائیں۔

ج۔ ہر قسم کی عسکری سرگرمی اور گروہ سے لاتعلقی اختیار کریں۔

۵-قومی سطح پر بینکنگ ریگولیٹری اتھارٹی کے ایک حصہ کے طور پر فنانشل انٹیلی جنس یونٹ قائم کیا جائے تاکہ رسمی بینکنگ کے شعبے میں منی لانڈرنگ، ہنڈی سسٹم اور ترسیلِ زر کے دیگر غیر رسمی ذرائع کی بندش ہو سکے۔

۶-پاکستانی مدرسوں میں غیر ملکی طلبہ کے داخلے کی سخت نگرانی کی جائے اور انہیں داخلوں کی صرف اسی وقت اجازت دی جائے اگر ایسی مذہبی تعلیم ان کے اپنے ملکوں میں دستیاب نہیں یا ان کی خود اپنے ملک کے داخلی محکموں اور پاکستانی حکومتی محکموں کی طرف سے مکمل چھان بین کی جا چکی ہو۔

۷-یقینی بنایا جائے کہ اصلاحات صرف شہری علاقوں تک محدود نہیں بلکہ تمام چھوٹے شہروں، قصبوں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیہاتوں میں بھی ان پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔

سفارشات برائے بین الاقوامی امداد دہندگان (ڈونرز)

۸- پاکستانی حکومت کو مدارس اصلاحات کے لیے اپنے وعدے اور ارادے پورے کرنے پر مجبور کیا جائے اور خصوصاً اس پر زور دیا جائے کہ وہ:

الف۔ ممنوعہ عسکری تنظیموں سے منسلک مدارس بند کرے۔

ب۔ وزیر داخلہ کی سربراہی میں ایسی ریگولیٹری اتھارٹی قائم کرے جسے مزاحمت پر قابو پانے کے لیے مناسب اختیارات حاصل ہوں۔

ج۔ رجسٹریشن، نصابی اصلاحات اور مالیاتی کنٹرول کے نظام کو رضا کارانہ کے بجائے لازمی بنیاد پر نافذ کرے۔

د۔ مدرسوں میں انٹیلی جنس ایجنسیوں کے کردار کو ختم کرے اور

ر۔ جتنا جلد ممکن ہو پارلیمانی نگرانی کا انتظام کرے۔

۹- تمام سطحوں پر سیکولر تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کے لیے پاکستان کی مالی امداد کی جائے، جس میں پیشہ ورانہ تربیت (ووکیشنل ٹریننگ) پر زور دیا جائے۔

۱۰- مدارس میں اصلاحات کے حکومتی پروگرام کے لیے مالی امداد دی جائے مگر صرف اس شرط پر کہ حکومت ممنوعہ تنظیموں سے منسلک مدارس بند کردے گی اور مدرسوں کو رضا کارانہ اپنے ذرائع آمدن ظاہر کرنے کے لیے نہیں بلکہ لازماً ظاہر کرنے کا پابند کیا جائے گا۔ اگر حکومت ایسا کرنے میں ناکام ہو جائے تو اس کو فنڈنگ روک دی جائے۔ بین الاقوامی مالیاتی ادارے بھی انہی شرائط پر امداد دیں۔

۱۱- یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ کچھ ڈونرز کو ممکن ہے مذہبی تعلیم کی براہ راست مدد کرتے ہوئے قانونی اور آئینی مشکلات پیش آئیں انہیں مخصوص منصوبوں کی مدد کرنے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ مثلاً

الف۔ سیکولر مضامین کی تدریس کے لیے نئے اساتذہ کی تربیت

ب۔ مدارس کے لیے جدید مضامین کی درسی کتب کی تیاری اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

د۔ مدارس اصلاحات اور دیگر تعلیمی معاملات میں حکومت کی کارکردگی کی نگرانی کے لیے سول سوسائٹی کی مدد

سفارشات برائے برطانیہ، سعودی عرب اور دیگر خلیجی ریاستیں

۱۲۔ ایسی خیراتی انجمنوں اور غیر سرکاری تنظیموں کی کھلے عام شناخت جن پر عسکریت پسندوں کے ساتھ تعلقات کا شبہ ہو۔

سفارشات برائے جی ایٹ کے ممالک خصوصاً برطانیہ اور امریکہ

۱۳۔ منی لانڈرنگ پر بین الحکومتی فنانشل ایکشن ٹاسک فورس (FATF) کی طرف سے دہشت گردی کے خلاف ۸ مالیاتی سفارشات پر مکمل عمل درآمد کیا جائے اور پاکستان پر زور دیا جائے کہ وہ ان معیارات پر پورا اترنے کے لیے قانون سازی کرے۔

۱۴۔ مقامی اسلامی تنظیموں کی مدد سے عوامی آگاہی کی ایک مہم چلائی جائے تاکہ بیرونِ ملک مقیم مسلمانوں کو جہادی مدرسوں کی مالی امداد کرنے سے روکا جائے اور اس غلط تصور کا خاتمہ کیا جاسکے کہ دہشت گردی کے خلاف مالیاتی قوانین کا اصل ہدف اسلامی تعلیم ہے۔

ان سفارشات کے اندازِ بیان اور مطلوبہ اقدامات کی نوعیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی ادارے پاکستان کے مدارس کو کن خدشات کے تحت دیکھ رہے ہیں۔ اور حکومت پاکستان پر ہر ممکن دباؤ کے ذریعے یہ یقینی بنانا چاہتے ہیں کہ حکومت بھی مدارس کے معاملے میں ایسی ہی سخت اور بے لچک پالیسی اختیار کرے اور اس سلسلے میں کسی نرمی سے کام نہ لے۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ مغربی اندیشوں کے اسباب و محرکات کی جڑیں محض حالیہ سیاسی واقعات اور مفادات کے پس منظر میں نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تاریخی اور تہذیبی شعور کے پس منظر میں بھی تلاش کی جائیں۔ مختصراً اس کی طرف ذیل میں اشارے کیے جا رہے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مغربی اندیشے: اسباب و محرکات

انتہا پسندی کے ساتھ مدارس کے مفروضہ تعلق کے ظاہری سبب سے ہٹ کر مدارس کے بارے میں مغربی تشویش کو وسیع تر پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس کے تین بڑے اسباب نظر آتے ہیں۔ پہلا سبب تو مسلمانوں اور مغرب کے درمیان تصورِ زندگی کا بنیادی فرق ہے۔ مسلمان مقاصدِ زندگی اور طریقِ زندگی کے لیے راہنمائی اپنے دین سے حاصل کرتے ہیں اور اسلام کو ایک مکمل ضابطہ حیات قرار دیتے ہیں۔ اس طرح انفرادی اور اجتماعی سطح پر ان کی زندگی کا کوئی شعبہ دینی راہنمائی سے خالی نہیں اسی لیے مذہبی تعلیم مسلمان معاشرہ کی ایک لازمی ضرورت قرار پاتی ہے جس میں کسی بھی طرح کی مداخلت خاص کر بیرونی قوتوں کی طرف سے ایک نہایت حساس معاملہ بن جاتی ہے۔ یہ مذہبی تعلیم ان کا رشتہ روایت کے اس سلسلہ سے جوڑتی ہے جو محض چودہ سو سال پرانا نہیں بلکہ یہ روایت ابتدائے آفرینش سے زمین پر انسان اور اس کے کردار کو خالق اور مخلوق کے تعلق کے حوالوں سے سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔

دوسری طرف مغربی معاشروں میں مذہب کی حیثیت ثانوی ہے۔ زندگی کو ذاتی اور اجتماعی دو خانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور مذہب کو اگر جینے کی اجازت ہے تو صرف ذاتی دائرے میں جبکہ اجتماعی دائرے میں اس کا کردار ناقابلِ قبول بلکہ ناقابل برداشت ہے۔ اس مغربی تصور کی جڑیں قرونِ وسطیٰ ۱۸ کی یورپی تاریخ میں پیوست ہیں جب مذہب نے کلیسائیت کی شکل میں ایک مضبوط ادارہ بن کر اور جاگیرداری نظام کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے معاشرے میں جبر، گھٹن اور تشدد کو رواج دیا اور اس کے ردِ عمل میں کہیں 'نشاۃ ثانیہ' (Rennaisance)، کہیں 'اصلاح مذہب (Reformation)' اور کہیں جدیدیت (Modernism) کی تحریکیں منظّم ہوئیں اور مذہب اور مذہبی کردار کو انسانی معاشرے اور انسانی امکانات کے لیے زہر ہلاہل سے تعبیر کیا جانے لگا۔ مغربی اہل علم اور اہل عقل کے نزدیک خدا کبھی کا مر چکا۱۹ اور اگر آج بھی کوئی معاشرہ یا کوئی قوم اپنی زندگیوں کو خدا کے نام پر ڈھالنے یا اپنی نسلوں کو مذہبی تعلیم سے آراستہ کرنے کی بات کرتی ہے تو وہ دنیا اور انسانیت کے مستقبل کے لیے ایک بڑا خطرہ ہے جسے اس کے خلاف جنگ یا اس کی اصلاح کی شکل میں ہی ٹالا جا سکتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرا سبب خاص کر مغربی ذہنوں میں راسخ یہ تصور ہے کہ مشرق و مغرب میں حائل خلیج کو پاٹا نہیں جا سکتا۔ مشہور انگیز شاعر رڈیارڈ کپلنگ کے یہ مصرعے اس تصور کی بجا طور پر عکاسی کرتے ہیں کہ

East is East and West is West
And never the twain shall meet

عالم اسلام کے ایک عظیم مفکر مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ان مصرعوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ

''میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ کوئی ادبی یا شاعرانہ اظہار میری نظر سے ایسا نہیں گزرا جس نے انسانیت کی بھلائی اور انسانوں کی یکجہتی کو اتنا نقصان پہنچایا ہو کیونکہ اس خیال نے انسانی خاندان کی مشرق اور مغرب میں تقسیم کو مستقل بنا کر پیش کیا ہے''[۲۰]۔

قطع نظر اس کے کہ کپلنگ کے یہ الفاظ کتنے سادہ ہیں اور انہوں نے ایک تاریخی صورت حال کو کتنی خوبی سے پیش کیا ہے لیکن اس طرح کے اظہارات سے دنیا بھر میں لوگ مشرق و مغرب کے درمیان مخاصمت کے تصور کو ایک بدیہی حقیقت کے طور پر سمجھنے لگے ہیں، جن کے درمیان سمجھوتہ ممکن نہیں۔ اور ''انہوں نے اگر کہیں ملنا بھی ہے تو صرف میدانِ جنگ میں اور اگر کہیں اکٹھے ہونا بھی ہے تو محض ایک دوسرے کی برائی کے لیے۔--- مشرق و مغرب صدیوں سے اس طرح محسوس کرتے آ رہے ہیں، یا تو ایک دوسرے کے بارے میں مکمل لاعلمی نے انہیں جدا رکھا یا ان کی معلومات ایک دوسرے کے بارے میں نہایت سطحی اور مصنوعی ہیں۔ وہ اپنے 'دشمن' کی زندگی کے صرف ان پہلوؤں کو دیکھتے ہیں جن سے ان کی کمزوری اور بدصورتی نمایاں ہو نہ کہ ان کی خوبیاں یا مضبوط پہلو۔ ان کا باہمی رویہ شک و شبہ، نفرت اور پھٹکار سے طے ہوتا ہے''[۲۱]۔

اس تصور کو مزید تقویت تہذیبوں کے تصادم[۲۲] جیسے نظریات سے ملتی ہے۔ امریکی مؤرخ اور اسکالر سیموئل ہنٹنگٹن نے اپنے اس مشہور مقالے میں اسلام کو ایک جنگجو نظریہ اور تہذیب قرار دیا ہے۔ اس کے خیال میں مسلمان جہاں بھی ہیں مسلم ممالک میں یا غیر مسلم ممالک میں وہ وہاں دوسرے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے ساتھ تنازعات کا باعث بن رہے ہیں۔ کمیونزم کے خاتمے کے بعد جدید دنیا میں اگر کسی عالمی جنگ کا خطرہ ہے تو وہ تہذیبی خطوط پر اسلام اور مغرب کے درمیان ہوگی۔ اور مغرب کو اسلام کے اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خطرے سے نمٹنے کے لیے حکمت عملی تیار کرنی چاہیے۔

ہنٹنگٹن کی اس تھیوری نے مشرق و مغرب دونوں جگہ لوگوں اور حکومتوں کو متاثر کیا اور بیشتر لوگوں نے مفروضہ تہذیبی تصادم کے پیرائے میں سوچنا شروع کر دیا۔ ۱۱ ستمبر کے تحقیقاتی کمیشن نے بھی اپنی رپورٹ میں واضح کیا ہے کہ ''دشمن محض دہشت گردی جیسی عمومی برائی نہیں بلکہ خطرہ اسلامی دہشت گردی کی طرف سے ہے''۔ بہت سے مغربی دانشوروں کے خیال میں ''اس جھگڑے میں مذہب کا کردار مرکزی ہے''۲۳۔ چنانچہ اگر اسلام خطرہ ہے تو اسلامی تعلیم کی ترویج کے اداروں کا خاتمہ یا ان کی اس طرح اصلاح کہ ان کی شکل اور پیغام بدل جائے ایک منطقی ضرورت اور ایک ناگزیر ترجیح بن جاتی ہے۔

مذہبی اسلامی تعلیم کے حوالے سے مغربی تشویش کا تیسرا سبب عالم اسلام میں مغربی ممالک کے سیاسی اور معاشی مفادات ہیں جنہیں مغربی طرزِ فکر کی حامل ایک عالمگیر تہذیب و ثقافت (Universal Culture) کو فروغ دیے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس مقصد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اسلام کا نظریہ اور تہذیب ہے جس کی تعلیم مسلمانوں کو اپنی انفرادی تہذیبی شناخت برقرار رکھنے کی ترغیب دیتی ہے اور مغربی تصورِ زندگی کو اپنے لیے خطرہ سمجھتی ہے۔ اس خطرے سے نمٹنے کی حکمت عملی میں اسلامی مدارس کی اصلاح اور یہاں جدیدیت کی ترویج پہلا ہدف قرار پاتی ہے۔

پاکستانی مدرسین میں اصلاح کی ضرورت کا احساس

مندرجہ بالا معروضات کا مقصد مدارس کے بارے میں مغربی اندیشوں کے اسباب و محرکات کو سمجھنا ہے تاکہ اصلاح کے حوالے سے ایک متوازن فکر کو تلاش کیا جا سکے۔ تبدیلی کی ضرورت کا احساس سب میں ہے لیکن نہ تو محض کسی کے دباؤ میں کی گئی اصلاحات نتیجہ خیز ہو سکتی ہیں اور نہ ہی محض ردعمل میں اصلاح کی ضرورت سے یکسر انکار کشمکش اور منافرت کے علاوہ کوئی نتیجہ برآمد کر سکے گا۔ اسی متوازن فکر تک پہنچنے اور اصلاح کی کوئی قابل عمل حکمت عملی وضع کرنے کے لیے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد نے مدارس میں اصلاح کے موضوع پر تمام متعلقہ افراد اور اداروں (stake holders) کی شمولیت کے ساتھ پاکستان کے مختلف شہروں میں چند سیمینارز کا انعقاد کیا۔ پانچ شہروں میں منعقدہ ان سیمیناروں میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شریک مدارس کے نمائندوں نے تسلیم کیا کہ اگرچہ مدارس معاشرے میں مذہبی اور تعلیمی اعتبار سے اہم خدمت انجام دے رہے ہیں لیکن یہاں کے نظام ونصاب میں نئے علوم وفنون سے بے اعتنائی، نوآبادیاتی دور کے کچھ تاریخی حقائق، اور وسائل کے فقدان کے سبب ایسی خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں کہ یہاں سے مطلوبہ میدانِ کار پیدا نہیں ہو رہے، تنگ نظری اور مسلکی تعصب میں اضافہ ہو رہا ہے اور یہاں کے طالب علم اور اساتذہ جدید دور کی تعلیمی، سماجی، سیاسی اور تہذیبی ضروریات وتقاضوں سے کماحقہ آگاہ نہیں ہیں۔ مزید براں یہ صورت حال مسلمان معاشروں کے لیے تو تشویش کا باعث ضرور ہے لیکن مغرب کو اس سے اپنے تہذیبی وجود کے لیے خطرہ محسوس کرنا غیر ضروری ہے۔

مدارس میں تبدیلی واصلاح کی ضرورت پر کراچی میں آئی پی ایس کے سیمینار کے ایک شریک اور جامعہ ستاریہ اسلامیہ کراچی کے مہتمم حافظ محمد سلفی نے اپنی گفتگو میں فرمایا تھا کہ

> زندگی تبدیلی کا نام ہے۔ اگر نصاب تعلیم وقت کے روحانی و مادی تقاضوں کو پورا نہ کر سکے تو سعی لاحاصل ہے۔ البتہ بنیاد سے وابستہ رہتے ہوئے نصاب میں تبدیلی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ حکومت کے تعلیمی ماہرین اور مختلف وفاق ہائے تعلیم کے ذمہ داران اخلاص اور نیک نیتی سے تعاون کریں تو یہ اہم ترین کام جلد ممکن ہو سکتا ہے[۲۴]۔

یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جناب حافظ محمد سلفی وفاق المدارس سلفیہ (اہل حدیث) کی نمائندگی کرتے ہیں اور اس مکتبہ فکر کے مدارس کو سعودی عرب کے مسلمانوں کی 'وہابی' سوچ سے وابستگی رکھنے کی بنا پر مغربی مصنفین سب سے زیادہ انتہا پسندی، رجعت اور تشدد سے منسوب کرتے ہیں۔ اسی طرح مدارس کے ایک اور نمائندے مولانا زاہد الراشدی جو گوجرانوالہ شہر میں ایک بڑا مدرسہ چلاتے ہیں، وہاں الشریعہ اکیڈمی کے ڈائریکٹر اور اسی نام سے ایک پرچے کے مدیر اعلیٰ بھی ہیں، لاہور کے ایک سیمینار میں پیش کردہ مقالے میں فرماتے ہیں:

> دینی مدارس میں تحقیق وتالیف کے ذوق اور صلاحیت کی آبیاری کے لیے کوئی اجتماعی اور اداراتی نظام موجود نہیں ہے۔ یہ کام زیادہ تر شخصی رجحان اور ذوق کا رہین منت ہوتا ہے۔ اور اس کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی اور نگرانی بھی شخصی طور پر ہی ہوتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مدارس کی اصلاح احوال کے حوالے سے انہوں نے کہا کہ

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو ذہنی وفکری برتری کے نفسیاتی ماحول کی ہے جس نے دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کے گرد رکاوٹوں کی بہت سی بلند وبالا دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں۔ ہمیں اس ماحول سے نکلنا ہوگا اور حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ہمارے سوا اور لوگ بھی اس دنیا میں رہتے ہیں اور وہ بھی عقل اور علم تک رسائی کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں۔ ان کی رائے سے اختلاف ہمارا حق ہے لیکن ان کے وجود سے اختلاف کا ہمیں حق حاصل نہیں ہے[۲۵]۔

دہشت گردی کا مدارس سے تعلق - ایک وضاحت

ICG کی مذکورہ بالا رپورٹ میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ دس سے پندرہ فیصد مدرسوں کا تعلق فرقہ وارانہ پرتشدد واقعات یا بین الاقوامی دہشت گردی کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ ساتھ ہی حکومت کی طرف سے یہ اعتراف بھی درج کیا گیا ہے کہ یہ تمام اعداد وشمار مصدقہ نہیں ہیں اور اعداد وشمار کی عدم دستیابی اصلاحات کے نفاذ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ جہاں تک دہشت گردی کے ساتھ مدارس یا مدارس میں دی جانے والی تعلیم کا تعلق ہے تو اس تصور کی بنیاد یہ ہے کہ افغانستان میں غیر ملکی جارحیت اور قبضے کے خلاف برسرِ پیکار طالبان کی اکثریت نے ان مدرسوں سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ درحقیقت دنیا میں آزادی کی جتنی بھی تحریکیں چلتی رہی ہیں یا چل رہی ہیں ان کی وجوہات قومی یا گروہی مفادات، قومی یا نظریاتی شناخت اور حق خود ارادیت کے تصورات میں تلاش کی جانی چاہییں۔ مدارس میں تعلیم کی نوعیت اور اس کے مقاصد کی روشنی میں دہشت گردی کے پیچیدہ مسئلے کو مدارس کے ساتھ جوڑ کر سادہ بنانا قرین انصاف نہیں۔ آئی پی ایس کے سیمیناروں میں شریک مدارس کے تمام نمائندوں اور علماء نے جو بحیثیت مجموعی تمام مسالک کی نمائندگی کرتے ہیں ہر طرح کی دہشت گردی، فرقہ وارانہ تشدد اور ظلم وجبر کے خلاف واضح مؤقف اختیار کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مدارس کے نظام تعلیم وتربیت میں مرور زمانہ کے ساتھ در آنے والی کمزوریوں اور خرابیوں کا بھی اعتراف کیا ہے خصوصاً بڑھتے ہوئے مسلکی رجحان اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسروں کے ذہنوں میں مدارس کی بگڑتی ہوئی تصویر پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے مدارس کی بہتری اور اصلاح کے لیے اپنی خواہش اور ارادہ بھی واضح کر دیا ہے۔ تنظیم المدارس اہل سنت کے صدر ڈاکٹر سرفراز نعیمی نے اسلام آباد میں سیمینار میں اپنے خطاب میں مدارس کے بارے میں غلط تصور کے خاتمے کے لیے فرمایا تھا:

حکمت عملی یہ ہونی چاہیے کہ ہم ان حضرات کو جو دینی مدارس سے کماحقہٗ واقف نہیں ہوئے ہیں، خاص طور پر وہ حضرات جن کا تعلق یورپ کے ساتھ ہے اور جو وہاں بیٹھے ہوئے پالیسیاں بنا رہے ہیں اور مستقبل کے مقاصد طے کر رہے ہیں ان کو دعوت دی جائے کہ وہ بذاتہ وبنفسہٖ آئیں اور دیکھیں کہ یہاں کیا پڑھایا جا رہا ہے۔ آج سے تین سال پہلے امریکہ کی پاکستان میں سفیر چیمبر لین نے جامعہ نعیمیہ کا آخری دورہ کیا تھا۔ ان کو تاثر یہ دیا گیا تھا کہ دینی مدارس دہشت گردی کے اڈے ہیں، وہاں معلوم نہیں کیا پڑھایا جاتا ہے۔ جب وہ واپس جا رہی تھیں، تو انہوں نے لاہور کے دورے کے دوران جامعہ نعیمیہ کا بھی دورہ کیا۔ انہوں نے سارے کا سارا مدرسہ دیکھا، طلبہ کس طرح پڑھ رہے ہیں، کس طرح حفظ کر رہے ہیں، وہ سسٹم دیکھا، کمپیوٹر لیب کو دیکھا، چھوٹے چھوٹے بچے کس طرح قرآن کریم کو یاد کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ متاثر ہوئیں اور انہوں نے کہا کہ جو کچھ ہمیں بتایا جا رہا تھا اور جو کچھ ہم نے دیکھا یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں ۲۶۔

مدارس: تاریخی ورثہ

دینی مدارس اسلام کی اس تاریخی تعلیمی روایت کے امین ہیں جس کا آغاز پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہوا تھا۔ مسلمان علماء نے علم کو دو اقسام میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ایک وہ علم ہے جو خدا کی طرف سے براہ راست وحی ہوا اور دوسرا وہ علم ہے جو انسان اپنی عقل، شعور، مشاہدے اور تجربے کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ لیکن ان دونوں طرح کے علوم میں تقسیم اور فرق کو مسلمان حتمی اور بدیہی نہیں سمجھتے بلکہ انسانی تجربے اور کوشش کے ذریعے حاصل کیے گئے علم میں بھی الوہی راہنمائی کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اسلام میں ہر دو علوم کو پوری اہمیت دی گئی ہے اور تمام مسلمان مردوں اور عورتوں پر حصول علم کی کوشش فرض

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی گئی ہے۔

مسلمانوں کے نزدیک قرآن براہ راست خدا کی طرف سے انسانوں کی راہنمائی کے لیے نازل کیا گیا ہے جس میں تغیر اور تبدل کا امکان نہیں پایا جاتا۔ مسلمان پورے احترام اور تقدس کے ساتھ اسے حفظ کرتے، اس کی آیات پر غور کرتے اور ان سے دنیا میں اپنے لیے راہنمائی اخذ کرتے ہیں اور دنیا میں دیگر علوم وفنون کے حصول کے ذریعے اپنی زندگیوں کو کارآمد اور مفید بناتے ہیں۔

مسجد وہ پہلا ادارہ ہے جہاں سے علم کی تحصیل اور ترویج کا آغاز ہوتا ہے۔ حضرت محمدؐ مسجد میں ہی لوگوں کے سامنے وحی الٰہی کی تعبیر کرتے اور دنیوی معاملات میں ان کی راہنمائی کرتے تھے[۲۷]۔ اسلام میں کلیسائیت کی طرز پر علماء کا کوئی ایسا مخصوص ادارہ بھی موجود نہیں رہا جو دینی معاملات میں مسلمانوں کی رہنمائی کو خدا کے نام پر اپنے ساتھ مخصوص کر لے اور تمام لوگ ان کی لازماً پیروی کے پابند ہو جائیں[۲۸] بلکہ کوئی بھی مسلمان جو قرآن پڑھ اور سمجھ سکتا ہو وہ عبادات و معاملات میں مسلمانوں کی قیادت کر سکتا ہے۔ اسی اصول کی بنا پر اسلامی دنیا دین و دنیا کی علیحدہ علیحدہ تقسیم سے بچی رہی اور مذہبی علماء یا دوسرے لفظوں میں 'کلیسا' اور ریاست قوت کے دو مدمقابل مراکز کے طور پر کبھی نہیں دیکھے گئے۔ اس نکتے سے یورپی مسیحی اور مسلم اسلامی تاریخی تجربے کا فرق واضح ہو جاتا ہے اور یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ کلیسائیت کے جبر کے خلاف نجات دہندہ سیکولرزم کے ظہور کی تاریخ کو مسلم دنیا میں دہرانا کیوں مشکل ہے۔

اسلام جب جزیرہ نمائے عرب سے باہر پہنچا اور مسلمانوں کو دیگر غیر عرب تہذیبوں، ثقافتوں اور زبانوں سے واسطہ پیش آیا تو ایسے مسلمان ماہرین تیار کرنے کی ضرورت پڑی جو قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر میں تخصص حاصل کر کے ایسی کتب وغیرہ تیار کریں جن سے دیگر نومسلموں اور غیر عربوں کی تعلیمی ضرورتیں پوری کی جا سکیں۔ اس طرح مدارس کی روایت کا آغاز ہوا، جو اعلیٰ تعلیم کے مراکز تھے اور جن کا ابتدائی مقصد سب کے لیے یکساں اور ہمہ گیر تعلیم کے ذریعے زندگی کے تمام شعبوں میں مذہبی راہنمائی فراہم کرنا اور اسلامی علمی مآخذ اور اثاثوں کی ترویج و تحفیظ تھا۔

اسلام میں اصحاب صفہ اور دیگر علمی مجالس کے علاوہ تاریخی طور پر پہلا مدرسہ جس کے بارے میں معلومات ملتی ہیں مصر میں فاطمی خلفاء نے ۱۰۰۵ء میں قائم کیا جہاں اقلیتی شیعی اسلام کی تعلیم دی جاتی تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس میں ایک تعلیمی ادارے کے تمام لوازمات موجود تھے۔ کتب خانہ (لائبریری) مختلف مضامین کی تدریس کے لیے مختلف اساتذہ اور طلبہ کو کاغذ، قلم، سیاہی وغیرہ مفت فراہم کیے جاتے تھے۔ یہاں دستیاب کتب کا ایک کیٹلاگ ۱۰۴۵ء میں تیار کیا گیا تھا جس کے مطابق مختلف مضامین بشمول فلکیات، فن تعمیر، فلسفہ پر ۶۵۰۰ کتب یہاں دستیاب تھیں ۲۹۔ جب مصر میں سنّی حکومت قائم ہوئی تو اس مدرسے سے شیعہ اسلام کی تعلیم کو ختم کر دیا گیا اور دنیوی علوم پر کتابوں کے علاوہ مذہبی اختلافی کتب ضائع کر دی گئیں۔ یہاں سے کتب کا ایک بڑا ذخیرہ بغداد پہنچا دیا گیا جہاں ایک سلجوک وزیر نظام الملک حسن بن الطّوسی نے ۱۰۶۷ء میں پہلا باقاعدہ اور منظّم مدرسہ قائم کیا۔ اس مدرسے میں دینی و دنیوی ہر دو طرح کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا تھا تاکہ زندگی کے تمام شعبوں کے ماہرین تیار ہو سکیں۔ بعد ازاں نظام الملک نے پوری سلطنت میں متعدد مدارس قائم کیے جہاں اسلامی علوم کے علاوہ سائنس، فلسفہ، امورِ مملکت اور پبلک ایڈمنسٹریشن کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ نظام الملک کو اسلامی عوامی نظامِ تعلیم (Islamic Public Education System) کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ ''سیاست نامہ''۳۰ کے نام سے پبلک ایڈمنسٹریشن پر ایک مشہور کتاب بھی انہوں نے تصنیف کی ہے۔

آئندہ صدیوں میں ان مدارس سے عظیم مسلمان مفکرین، سیاست دان، سائنس دان، الٰہیات و فلسفہ، فلکیات و الجبرا، جیومیٹری، طب غرض من جملہ متداولہ علوم کے ماہرین پیدا ہوئے۔ ان مدارس میں تعلیم کا ایک خاص پہلو اجتہادی منہاج فکر کی پرداخت بھی تھا۔ سادہ الفاظ میں اجتہاد سے مراد دین کی رہنمائی میں عقل، علم اور تجربے کے ذریعے مسائل کا استنباط ہے۔ اجتہاد کے اصول نے زمانے کی ہر کروٹ میں مسلمانوں کو جمود اور پسماندگی سے بچائے رکھا اور انہوں نے علمی، سیاسی اور تہذیبی ہر چیلنج کا بخوبی مقابلہ کیا۔ بعد کے زمانوں میں مسلمانوں کے جمود اور پسماندگی کی بڑی وجہ اجتہاد کے بجائے تقلید محض کو اختیار کر لینا ہی بیان کیا جاتا ہے ۳۱۔

مدرسہ نظامیہ بغدادیہ کے قیام سے شروع ہونے والا مدارس کا سلسلہ رفتہ رفتہ پوری اسلامی دنیا میں پھیل گیا اور شرق اوسط سے وسط ایشیا اور اندلس (سپین) سے برصغیر پاک و ہند اور مشرق قریب و بعید میں بے شمار بڑے بڑے مدارس قائم ہوئے جنہوں نے علوم و فنون کی ترقی میں نہایت شاندار خدمات انجام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیں۔ یہاں مسلمان علماء نے علم و تحقیق و ترجمہ کے میدان میں ایسا سرمایۂ علمی مہیا کیا جو بعدازاں یورپ کے علماء و سائنس دانوں کے لیے نئی دریافتوں اور ایجادات کی بنیاد بنا۔

یورپی روشن خیالی کے عہد میں مسلمانوں کا تعلیمی ڈھانچہ ان کے سیاسی زوال کے ساتھ ہی زوال پذیر ہو چکا تھا۔ مادی تنزل اور پسماندگی، سیاسی اقتدار سے علیحدگی اور روحانی ترفع (spirtual integrity) سے محرومی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان علماء نے دنیوی علوم اور سائنسز سے بے رغبتی اختیار کر لی اور اجتہاد کا دروازہ بند کر کے مذہبی علوم میں تقلید محض کے دامن میں پناہ لی۔ مسلم دنیا کے طول و عرض میں پھیلے مدارس پر ان حالات کا گہرا اثر ہوا۔ اکثر مدارس نے عقلی علوم کا راستہ چھوڑ کر قرآن و حدیث میں بنیادی اسلامی تعلیمات تک خود کو محدود کر لیا۔ رہی سہی کسر یورپی نو آبادیاتی طاقتوں نے پوری کر دی اور مسلمانوں کا بچا کھچا اقتدار بھی ان کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ ان نو آبادیاتی طاقتوں نے مدارس کے نظام کی جگہ جدید مغربی نظام تعلیم متعارف کرایا اور نئے نظامِ مملکت و سیاست میں تمام کار پرداز اسی جدید نظام تعلیم سے آنے لگے اور مدارس کے فارغ التحصیل نہ صرف بے مصرف ہو کر رہ گئے بلکہ اس نئے نظام تعلیم کے متعارف ہونے سے معاشرے میں ایسی طبقاتی تقسیم پیدا ہو گئی جس میں طبقہ اشرافیہ کے لیے جدید سیکولر نظام اور غریب طبقوں کے لیے مدارس مخصوص ہو کر رہ گئے۔

نو آبادیاتی نظام کے تعلیم پر اثرات اور مدارس کی حکمت عملی

برصغیر پاک و ہند وہ خطہ ہے جہاں برطانوی اقتدار میں مدارس کا نظام تبدیلی کے ایک بڑے مرحلے سے گزرا۔ یہاں نئے نظام سیاست اور نئے نظام تعلیم کو مسلمانوں کی اسلامی شناخت کے لیے ایک خطرے سے تعبیر کیا گیا۔ اپنی مکمل تحلیل کے پیش نظر برصغیر کے مدارس نے خود کو قرآن و حدیث اور فقہ کی تدریس تک محدود کر لیا تاکہ بنیادی اقدار اور تعلیمات کی حفاظت کی جا سکے اور عبادات اور شخصی معاملات میں معاشرے کی مذہبی ضروریات پوری کی جاتی رہیں۔ یہ ایک لحاظ سے خود کو ایک قلعے میں محصور کر لینے کے مترادف تھا جس سے باہر نکلنا یا جس میں کسی کو داخلے کی اجازت دینا اپنے وجود کی بقا کے لیے خطرے کو دعوت دینا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاہم یہاں یہ وضاحت اہم ہے کہ برصغیر میں مدارس کا نظام اسلامی تعلیمی نصاب اور طریقِ تدریس کے حوالے سے جس تبدیلی سے گزرا، یہاں جس طرح دنیوی علوم کو شجرِ ممنوعہ قرار دیا گیا، دیگر خطوں خصوصاً عرب ممالک میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ دیگر ممالک کے مدارس کے نصاب میں بھی اگرچہ کچھ تبدیلی آئی لیکن بیشتر مدرسہ نظامیہ بغداد کے تعلیمی نظام کو برقرار رکھا گیا جس میں دینی و دنیوی دونوں علوم نصاب میں شامل رہے۔ مصر میں خاص طور پر یہ بات درست ہے کہ جہاں جامعہ الازہر میں دینی علوم میں تخصص کے ساتھ ساتھ دنیوی علوم پر بھی توجہ دی جاتی ہے[۳۲]۔

برصغیر میں برطانیہ کے زیرِ اثر مغربی تہذیبی تفوق اور تعلیمی برتری کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں میں تین طرح کے ردِعمل سامنے آئے۔ پہلا ردِعمل علمائے دیوبند کا تھا جنہوں نے دفاعی انداز اختیار کرتے ہوئے اسلامی اقدار و روایت کو بچانے کی کوشش کی اور دینی علوم میں رسوخ پیدا کرنے پر زور دیا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں:

عیسائیت کی ترویج و اشاعت میں [انگریز] حکومت کی سرگرمی اور گرم جوشی اور مغربی تہذیب کی عوام میں غیر معمولی تیزی کے ساتھ مقبولیت اور مسلمانوں کے عقائد اور اخلاق و معاشرت میں اس کے اثرات کی وجہ سے ان لوگوں کو اقدام کے بجائے دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ انہوں نے اس کی فکر شروع کی کہ دینی جذبہ، اسلامی روح، اسلامی زندگی کے مظاہر اور تہذیب اسلامی کے جتنے بچے کھچے آثار باقی رہ گئے ہیں ان کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے لیے قلعہ بندیاں کر لی جائیں اور پھر ان قلعوں میں (جن کو عربی مدارس کے نام سے پکارا گیا ہے) مبلغ اور داعی تیار کیے جائیں۔ اس عظیم اصلاحی اور تعلیمی تحریک کے (جس کا آغاز ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں ہوا) سربراہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ[۳۳] بانی دارالعلوم دیوبند تھے۔

آج پاکستان میں وفاق المدارس العربیہ (دیوبند) کے تمام مدارس، جو اپنی تعداد اور اثر و رسوخ کے اعتبار سے سب سے بڑھ کر ہیں، اسی تحریک کے پروردہ ہیں۔ مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی کے الفاظ میں 'بقائے اسلام اور تحفظ علم دین'[۳۴] اس تحریک کا نصب العین تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرا ردعمل تحریک ندوۃ العلماء کی شکل میں سامنے آیا۔ اس تحریک کے بانی مولانا محمد علی مونگیری تھے اور یہ ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء میں وجود میں آئی۔ مولانا مونگیری کے بعد اس کی راہنمائی مولانا شبلی نعمانی اور ان کے رفقاء نے کی۔ یہ مدارس کے نصاب میں اصلاح کی پہلی آواز تھی جس نے جدید وقدیم کے امتزاج سے متوازن فکر پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ مولانا ندوی اس تحریک کے مؤقف کے ضمن میں لکھتے ہیں:

ان کے نزدیک دینی نصابِ تعلیم ایک تغیر وترقی پذیر ذریعہ تعلیم وتربیت تھا جس کو زمانے کی تبدیلیوں اور تقاضوں کے مطابق (اپنی روح ومقاصد اور اساسی علوم کی حفاظت کے ساتھ) بدلتے اور ترقی کرتے رہنا چاہیے [۳۵]۔

پاکستان کے سابق وفاقی وزیر برائے مذہبی امور اور بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر محمود احمد غازی نے مدارس کے موضوع پر آئی پی ایس کے سیمینار منعقدہ اسلام آباد (۶ مئی ۲۰۰۴ء) میں فرمایا تھا کہ ''دارالعلوم دیوبند کا قیام ۱۸۶۶ء میں ہوا۔ اس کے چند سال کے اندر اندر اس بات کا احساس کیا جانے لگا تھا کہ دینی تعلیم میں اختصاص کے ساتھ ساتھ علمائے کرام کو کچھ دنیاوی تعلیم بھی درکار ہے تاکہ وہ دین کی تعلیم کو دورِ جدید کی زبان میں بیان کرسکیں۔ چنانچہ اسی ضرورت کا ادراک کرتے ہوئے ندوۃ العلماء کے ادارے کا قیام عمل میں لایا گیا جو صفِ اول کے علماء کے ہاتھوں انجام پانے والی وہ پہلی کوشش تھی جس میں دینی تعلیم کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی'' [۳۶]۔

بدقسمتی سے یہ تحریک برصغیر میں قدیم وجدید دونوں طبقوں کا پرجوش تعاون حاصل نہ کرسکی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے نزدیک اس کا بڑا سبب ان اہل فکر واہل دعوت کی کمی تھی جو ان دونوں ثقافتوں کے حامل ہوں اور دونوں کو اچھی طرح ہضم کرچکے ہوں اور ان اجزاء سے جو بظاہر متضاد نظر آتے ہیں ایک پاکیزہ، معتدل، خوشگوار اور مفید مجموعہ بناسکتے ہوں [۳۷]۔

تیسرا ردعمل جدید روشن خیال گروہ کی طرف سے سامنے آیا۔ علی گڑھ تحریک کی شکل میں اس کا علم سرسید احمد خان نے بلند کیا۔ وہ مغربی تہذیب اور اس کی مادی بنیادوں کی تقلید اور جدید علوم کو بغیر کسی ترمیم و تنقید کے جوں کا توں اختیار کرلینے کے داعی تھے اور اس میں برصغیر کے مسلمانوں کی فلاح دیکھتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سر سید اپنے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ سویلائزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تا کہ جس حقارت سے سویلزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب کہلاویں ۳۸۔

علی گڑھ سکول و کالج نے ہندوستان میں کافی شہرت حاصل کی تاہم مسلمانوں کے نقطہ نظر سے اس میں دو کمزوریاں تھیں اولاً اس میں انگریزی تعلیم کو مقامی معاشرتی و مذہبی تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے جوں کا توں اختیار کر لینے پر زور دیا گیا تھا اور ثانیاً ان کی توجہ عملی علوم کے بجائے صرف انگریزی زبان و ادب کی تحصیل پر مرکوز تھی بلکہ سر سید صنعتی تعلیم کی تجویز کی مخالفت کرتے تھے۔

قیام پاکستان: اسلامی نظام حکومت کا خواب اور مسلمانوں کی توقعات

پاکستان کا قیام ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو برصغیر میں دو قومی نظریے کی بنیاد پر عمل میں آیا تھا۔ دو قومی نظریے سے مراد یہ تھی کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں آباد ہیں اور دونوں کو اپنے اپنے نظریہ زندگی کے مطابق اپنی ریاست تشکیل دینے اور زندگی گزارنے کا حق ہے۔ چنانچہ قیام پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اسلامی نظام حکومت کے قیام کی خواہش کا نتیجہ تھا۔ اس خواہش کا تقاضا تھا کہ یہاں کے نظامِ مملکت، سیاست، معاشرت اور تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالا جائے۔ آئین، قانون اور تعلیم تینوں سطحوں پر اس کے لیے کوششیں کی گئیں، پاکستان کے تینوں آئینوں ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء میں قراردادِ مقاصد کی شمولیت اور اسلامی شقوں کا نفاذ ان کوششوں کا ایک مظہر ہے لیکن جدید و قدیم میں آویزش اور مقتدر طبقے کی بالادستی کے طفیل جو برطانوی راج کی نافذ کردہ جدید انگریزی تعلیم کا پروردہ تھا عملاً اس خواب کی تعبیر ابھی تک حاصل نہ کی جا سکی۔

اس مقصد اور خواہش کے پس منظر میں اسلامی نظام تعلیم کی ترویج کے دعوے دار یہاں کے دینی مدارس کا فرض تھا کہ وہ اسلامی منہاج کی تعبیر و تشریح کے ذریعے معاشرے اور نظام میں اپنے زیادہ موثر، فعال اور آزادانہ کردار کی توثیق کرتے لیکن انہوں نے پاکستانی حکومتوں کو انگریزی دور کی باقیات قرار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیتے ہوئے اپنی سابقہ دفاعی حکمت عملی کو برقرار رکھا جس کا مقصد اسلامی تعلیم کی مبادیات اور اب تک کے علمی ورثے کی حفاظت کے سوا کچھ نہ تھا۔ سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں مدارس کی اصلاح کی آوازیں وقتاً فوقتاً اٹھتی رہیں لیکن عملاً سرکاری سطح پر بے دلی سے کی گئی کوششیں اور مدارس کی سطح پر تحفظات، حکومتی اقدامات پر شبہات اور نیم دلانہ طرز عمل کے سبب مدارس اپنی پرانی ڈگر پر چلتے رہے۔ اس پس منظر میں اب ہم پاکستان میں مدارس کے اعداد وشمار کا ایک مختصر جائزہ لینے کے بعد اصلاحات کے لیے اب تک کی حکومتی کوششوں اور ان پر مدارس کے ردعمل کا جائزہ لیں گے اور آخر میں ان تجاویز اور سفارشات کو پیش کریں گے جو زیادہ تر آئی پی ایس کے پالیسی سیمناروں (۲۰۰۴ء) کے شرکاء اور مقررین کی طرف سے سامنے آئیں۔

پاکستان میں دینی مدارس کے اعداد وشمار پر ایک نظر

پاکستان کے دینی مدارس کو جب سے دہشت گردی اور انتہا پسندی سے منسوب کیا گیا ہے مغربی میڈیا اور تحقیقی اداروں میں ان مدارس کی تعداد، کردار، تعلیم، نظام وغیرہ کے بارے میں جاننے اور رپورٹیں، تجزیے اور مضامین لکھنے کی ایک دوڑ شروع ہو چکی ہے۔ لیکن چند ایک تحقیقی اور سنجیدہ رپورٹوں کے علاوہ زیادہ تر تجزیے قیاس آرائیوں کی بنیاد پر حاصل کردہ اعداد وشمار اور مدارس کے چند وابستگان سے کیے گئے انٹرویوز کی بنیاد پر کیے جا رہے ہیں، جو صورت حال کو مزید پیچیدہ بنانے کا باعث بن رہے ہیں۔ مختلف مضامین میں ان مدارس کی تعداد سات ہزار سے پچاس ہزار تک بیان کی جاتی ہے لیکن قابلِ اعتبار اعداد وشمار کسی کے پاس دستیاب نہیں۔ اس ابہام اور تضاد کی دو بڑی وجوہات ہیں۔ اولاً مکمل اور وسیع البنیاد اعداد وشمار جمع کرنے کی حکومت کی طرف سے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ اگرچہ ساٹھ، ستر اور اسّی کی دہائیوں میں مختلف رپورٹس تیار کی گئیں لیکن وہ شماریاتی پہلو سے نامکمل اور ادھوری ہیں۔ اور ثانیاً مدارس کی درجہ بندی کا مسئلہ ہے۔ چونکہ مسلم ممالک میں روایتاً قرآن اور عقائد کی تعلیم ایک لازمی حیثیت رکھتی ہے جس کے بغیر مسلمان اپنے عبادات ومعاملات کے فرائض سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے، اس لیے اس کا اہتمام گھر، محلے اور مسجد کی سطح پر کیا جاتا ہے۔ تعلیم وتربیت کے ایسی روایتی سلسلوں کو بھی اگر مدارس کی تعریف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں شمار کر لیا جائے تو یہ تعداد ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں میں پہنچ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعداد و شمار کا تعین کرتے ہوئے مدارس کی جامع تعریف کو مدنظر رکھنا پڑے گا کہ کس درجے تک اور کتنی تعداد میں طلبہ کو تعلیم دینے والے اداروں کو مدرسے کہا جائے گا جہاں تعلیم و تربیت کا ایک باقاعدہ نظام موجود ہو اور جہاں امتحان لے کر طلبہ کو اسناد دی جاتی ہوں۔ اسی طرح بہت سے مدارس میں طلبہ اپنی تعلیم مکمل نہیں کرتے اور مختلف درجوں میں تعلیم چھوڑ کر اپنے کام دھندوں میں لگ جاتے ہیں۔

مدارس پر جمال ملک کی ابتدائی تحقیق کے مطابق قیام پاکستان (۱۹۴۷ء) کے وقت پاکستان میں صرف ۱۳۷ مدرسے تھے اور ۱۹۵۶ء میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق پورے مغربی پاکستان میں اس وقت ۲۴۴ مدرسے موجود تھے[۳۹]۔ ایک اور مصنف کے مطابق ۱۹۴۷ء میں مغربی پاکستان میں ۱۳۷ مدرسے تھے، ۱۹۹۴ء میں جن کی تعداد اندازوں کے مطابق صرف پنجاب میں ۲۵۰۰ تک پہنچ چکی تھی۔ جو پاکستان کے چاروں صوبوں میں آبادی کے اعتبار سے سب سے بڑا صوبہ ہے[۴۰]۔ ممتاز احمد کے بقول ۲۰۰۱ء تک پاکستان میں ۶۰۰۰ مدرسے اور ان میں ۶۰۴۴۲۱ طلبہ زیر تعلیم تھے[۴۱]۔ ICG کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں مدارس کی تعداد ڈاکٹر محمود احمد غازی (سابق وزیر تعلیم) سے انٹرویو کے حوالے سے لگ بھگ ۱۰۰۰۰ اور طلبہ کی تعداد دس لاکھ سے سترہ لاکھ کے درمیان ہے[۴۲]۔

مدارس میں اصلاحات اور پاکستانی حکومتیں

پاکستان کے مدارس میں اصلاحات آج مغربی پالیسی کا اہم جزو ہیں۔ تاہم انہیں ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ میں ہونے والی دہشت گردی کے واقعات سے منسلک کرنا کچھ ایسا درست نہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں گزشتہ تین سو سال سے دینی تعلیم اور دینی مدارس میں ترمیم اور اصلاح کی آوازیں وقتاً فوقتاً اٹھائی جاتی رہی ہیں۔ اگرچہ انہیں مدارس پر دہشت گردی کے الزام کے ساتھ تو نہیں مخصوص کیا جاسکتا البتہ گزشتہ صدیوں میں یہ کوششیں بہر حال مسلمان ممالک میں مغربی تہذیب کے نفوذ کے مقابلے میں اسلامی تہذیبی شناخت کے لیے کی گئی ہیں۔

یہاں اس فرق کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے جو مسلمان معاشروں میں اصلاح کے مغربی تصور اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلم تصور کے درمیان ہے۔ اصلاح کے لیے مغربی کوششوں کا منتہا، یہاں آزادی، جدیدیت اور سیکولرازم کا اجراء ونفاذ ہے اور بدیہی طور پر اسلامی تہذیب وشناخت کا احیاء ان کا مقصود نہیں۔ جبکہ مسلمان زعماء اور علماء کے نزدیک اصلاح سے مراد مسلمانوں کی موجودہ پسماندگی اور تنزل کو دور کر کے مسلمانوں کو زمانے کے ساتھ چلنے اور اس کے تقاضوں سے عہدبرا ہونے کے قابل بنانا ہے۔ اس عمل میں اپنی تہذیبی اور اسلامی شناخت انہیں بہت عزیز ہے۔

قیام پاکستان سے قبل دینی تعلیم میں اصلاح کے لیے جو آوازیں اٹھیں دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء اور علی گڑھ تحریک کے ذکر میں ان کی طرف نشان دہی کی گئی ہے۔ اس کے بعد بھی برصغیر میں گزشتہ سو سال کے دوران بے شمار تجربے ہوئے جن کا مقصد دینی تعلیم کا ایک ایسا بنیادی نظام وضع کرنا تھا جس میں دینی متخصصین کو دورِ جدید کے ضروری علوم سے کسی حد تک واقف کرایا جاسکے۔ ۱۹۲۵ء میں ریاست بہاول پور میں جامعہ عباسیہ کے قیام کا مقصد بھی یہی تھا کہ ایسے دینی متخصصین پیدا کیے جائیں جو دورِ جدید کے معاملات اور مسائل سے کماحقہ، واقف ہوں تاکہ دین کی تعلیم اور احکام کو دورِ جدید کی زبان میں بیان کرسکیں۔

قیام پاکستان کے بعد بھی سرکاری اور غیر سرکاری دونوں سطحوں پر اس ضرورت کا احساس کیا جاتا رہا۔ پاکستانی مدارس میں اصلاحات کا یہ سلسلہ ایک لحاظ سے ایوب خان کے دور میں ہی شروع ہو چکا تھا اور بعدازاں جتنی بھی حکومتیں آئیں اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ قدامات کیے جاتے رہے لیکن کبھی یہ اقدمات وقتی سیاسی ضرورتوں اور مصلحتوں کے تحت کیے گئے اور کبھی نیم دلی کے ساتھ نیم پختہ تجاویز پیش کی گئیں جو مکمل طور پر بارآور نہ ہوسکیں۔

ایوب دور میں اصلاحات

جنرل مشرف کی طرح جنرل ایوب خان بھی ملک کے مذہبی طبقے سے نالاں جدید خیالات کے آدمی تھے اور مذہبی اداروں پر سرکاری کنٹرول کو وسعت دینے کے لیے جدید اسلام کی ایک سرکاری شکل کی ترویج چاہتے تھے تاکہ داخلی سطح پر اپنی فوجی حکومت کے جواز کو مضبوط بنایا جاسکے اور خارجی طور پر بھارت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ساتھ مقابلے میں علماء کی مدد سے عوامی حمایت حاصل کی جا سکے۔ اس دوران امریکہ اور روس کے درمیان عالمی سطح پر سرد جنگ کا آغاز بھی ہو چکا تھا اور امریکہ کا اتحادی ہونے کی حیثیت سے بے خدا کمیونزم کے مقابلے میں پاکستان کی ایک جدید مسلم شناخت بھی ضروری تھی۔

اس کے لیے ایوب حکومت نے سب سے پہلے اوقاف کے نظام کے تحت مذہبی طبقات کے تصرف میں موجود عمارتوں اور جائیداد کو سرکاری سرپرستی میں لے لیا۔ مساجد، مدرسوں، خانقاہوں اور دیگر مذہبی مقامات کی نگرانی اور ان کے انتظام کو مربوط بنانے کے لیے اوقاف کا ایک محکمہ قائم کیا گیا[۴۳]۔ مدارس نے حکومت کے اس اقدام کو اپنی خودمختاری کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اس کے جواب میں ۱۹۵۹ء اور بعد کے سالوں میں مدارس کے مسلکی بنیاد پر چار وفاق تشکیل دیے[۴۴]۔

ایوب خان نے مدارس کے نصاب میں جدید مضامین متعارف کرانے کی بھی کوشش کی تاکہ مدارس کے طلبہ بھی دیگر شعبہ جات میں جا سکیں اور بطور شہری اپنا پورا کردار ادا کر سکیں۔ مدارس کے نصاب میں اضافہ کے طور پر سرکاری اسکولوں میں پڑھائے جانے والے پرائمری کے نصاب کو شامل کر دیا گیا۔ لیکن ایوب خان کی یہ اصلاحات تقریباً تمام مذہبی جماعتوں کی مخالفت کے سبب ناکام ہو گئیں۔

بھٹو دور (۷۲-۱۹۷۷ء) میں اصلاحات

ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے پہلے منتخب وزیراعظم تھے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں ان کی پاکستان پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان میں کامیابی حاصل کی لیکن انہیں مشرقی پاکستان سے ایک بھی نشست نہ مل سکی۔ جہاں عوامی لیگ نے اکثریت حاصل کی تھی۔ مشرقی پاکستان، پاکستان کا اکثریتی صوبہ تھا، عوامی لیگ کو اقتدار سونپنے سے انکار پر بالآخر ۱۹۷۲ء میں پاکستان دولخت ہو گیا اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ بھٹو نے بچے کھچے پاکستان کا اقتدار سنبھالا اور قومی جذبے کو بیدار کرنے کے لیے بھارت مخالفت اور پان اسلام ازم کے تصور کا سہارا لیا جو ستر کے عشرے میں عرب دنیا میں مقبولیت حاصل کر رہا تھا۔ اس میں انہوں نے پاکستان کی اسلامی شناخت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی اور سوشلزم کے اثرات کے تحت اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگایا۔ ان کے دور میں ۱۹۷۳ء کا آئین تیار ہوا جس میں اسلامی جماعتیں اسلام کو سرکاری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مذہب قرار دینے میں کامیاب ہوئیں۔ اس دوران اسلامی نظریاتی کونسل کو اختیار دیا گیا کہ وہ پاکستانی قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لے تجاویز دے۔ بھٹو نے تعلیمی شعبے کو قومیانے کا اعلان کیا اور اس عمل میں مدارس کی خود مختاری کو برقرار رکھا[45]۔

بھٹو نے مدارس کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ان کی اسناد کو تسلیم کرنے کی مشروط کی پیشکش بھی کی اور وفاق المدارس العربیہ کی اعلیٰ سند کو ایم اے اسلامیات کی ڈگری کے مساوی تسلیم کرنے کا اعلان کیا بشرطیکہ مدرسے کے طلبہ بی اے کی انگریزی کا پرچہ پاس کرلیں۔ لیکن مدارس نے یہ تجویز تسلیم نہ کی۔ بھٹو حکومت نے سرکاری اسکولوں میں مڈل اور ہائی اسکول کی سطح پر نصاب میں عربی زبان کی تدریس کو بھی شامل کیا اور مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کو بطور استاد ان سکولوں میں عربی پڑھانے کی دعوت دی۔ نیز عرب ممالک خصوصاً سعودی عرب کے ساتھ پاکستان میں عربی زبان اور اسلامی علوم کی ترویج کے لیے معاہدے بھی کیے۔ بعدازاں پاکستان میں خصوصاً جنوبی پنجاب میں جو نئے مدرسے کھلے انہیں عرب ممالک سے امداد بھی ملنا شروع ہوئی[46]۔ تاہم بھٹو کی ان کوششوں کو مدارس کی طرف سے پذیرائی نہ مل سکی اور مذہبی جماعتوں اور طبقوں نے بھٹو مخالف تحریک میں حصہ لیا۔

ضیاء دور (۷۷-۱۹۸۸ء) میں اصلاحات

جنرل ضیاء الحق نے ۱۹۷۷ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار سنبھالا۔ انہیں مدارس میں انتہاپسندی، فرقہ واریت اور عسکریت پسندی کے فروغ کا ذمہ دار بھی سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے پاکستان میں اسلامائزیشن اور سیاست دانوں کے احتساب اور اسلامی نظام کے دعوے کے ساتھ اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ ان کا دور عالمی سیاست کی گرم بازاری کا دور تھا۔ ایک طرف انقلابِ ایران (۱۹۷۹ء) نے دنیا کے بیشتر مسلمانوں میں اسلامی انقلاب کی جوت جگا دی تھی اور دوسری طرف افغانستان پر روسی جارحیت سے خطے میں نئی عالمی کشمکش کا آغاز ہو چکا تھا، اور دنیا مختلف اور متحارب بلاکوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ اسی دوران ایران-عراق جنگ (۸۰-۱۹۸۸ء) بھی جاری تھی اور سنی عرب ایران کے خلاف متحد ہو رہے تھے اور قریبی مسلم ممالک میں اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے کے لیے ایک دوسرے پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

افغانستان پر روسی جارحیت کے بعد روسی کمیونزم کا مقابلہ کرنے کے لیے امریکہ نے عرب ممالک کے ساتھ مل کر افغانیوں کو کمیونسٹوں کے خلاف جہاد کے لیے تیار کیا اور اس میں پاکستان کی مدد سے پاکستان و افغانستان کے دینی مدارس کے طلبہ کو بھی استعمال کرنے کا فیصلہ کیا جو افغانستان کی دینی حمیت کے ساتھ گہری وابستگی رکھتے تھے۔ امریکہ، عرب ممالک اور پاکستان حکومت کی سرپرستی سے افغان جنگ میں تو کامیابی حاصل کر لی گئی لیکن مدارس میں فرقہ وارانہ تقسیم گہری ہوگئی اور پاکستان میں فرقہ واریت پرتشدد راستے پر چل نکلی۔ اگرچہ اس کی کوئی ٹھوس شہادت موجود نہیں کہ مدارس بحیثیت مجموعی براہ راست فرقہ وارانہ دہشت گردی میں ملوث ہو گئے لیکن مدارس میں مسلکی بنیاد پر نعرے بازی سے ملک دشمن عناصر اور غیر ملکی دشمن ایجنسیوں کو مختلف فرقوں کے نام پر ایسی کارروائیاں کرنے کا موقع مل گیا جو کسی مسلم فرقے یا پاکستان کے مفاد میں نہ تھیں بلکہ ملک میں عدم استحکام پیدا کرنے کے لیے دشمن کے عزائم کو پورا کرتی تھیں۔

ضیاء دور میں اسلامی نظام متعارف کرنے کی کوشش دو سطحوں پر کی گئی۔ اولاً قانونی نظام پر نظر ثانی اور اسلامی قوانین کو متعارف کرایا گیا اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے شرعی عدالتیں قائم کی گئیں۔ پاکستان میں حدود قوانین کا نفاذ (۱۹۷۹ء) بھی اس کی ایک کڑی ہے، سیکولر حلقوں کی طرف سے جن کی سخت مخالفت کی گئی اور ان کو برقرار رکھنے، ترمیم کرنے یا منسوخ کرنے کی بحث ابھی تک جاری ہے۔ معیشت کو اسلامی اصولوں پر چلانے کے لیے بھی ابتدائی قانون سازی کی گئی تاکہ مرحلہ وار انداز میں بینکوں سے سود کا خاتمہ کیا جا سکے۔ بینکوں میں مسلمان کھاتے داروں کی بچت میں سے زکوٰۃ کی کٹوتی کو لازمی کر دیا گیا۔ جون ۱۹۸۰ء میں زکوۃ اور عشر آرڈی ننس لایا گیا اور حکومت نے پہلی بار مذہبی ٹیکسوں کی وصولی کا انتظام باقاعدہ طور پر سنبھالا۔ اس کے لیے صوبائی، ضلعی اور تحصیل کی سطح پر زکوٰۃ کمیٹیاں قائم کی گئیں۔

ثانیاً ذرائع ابلاغ کے ذریعے بھی اسلامائزیشن کے عمل کی تشہیر کی گئی اور ریاست کے تمام شعبوں، سول سروس، فوج، تعلیمی نظام، تحقیقی اداروں اور حتیٰ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو بھی اسلامی سانچے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈھالنے کے اعلانات اور عوام میں مذہبی تنوع اور مسلکی اختلافات کا لحاظ رکھے بغیر چند اقدامات بھی کیے گئے۔ سیکولر سیاسی اشرافیہ اور غیر سرکاری مغرب پسند تنظیموں کی طرف سے ان اقدامات کو تشویش کی نظر سے دیکھا گیا۔ بعض حلقوں کی طرف سے انہیں ملک میں مذہبی فرقہ وارانہ تقسیم کو گہرا کرنے کا ذمہ دار بھی سمجھا گیا۔ ۱۹۸۰ء میں اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے پارلیمانی جمہوریت کو غیر اسلامی قرار دینے[۴۷] کے بعد ایک مجلس شوریٰ قائم کی گئی جس میں تمام مسالک کے علماء کو نمائندگی دی گئی۔ تعلیم کو اسلامیانے کے ضمن میں ۱۹۷۹ء کی تعلیمی پالیسی میں ۵۰۰۰ مسجد سکول قائم کرنے کا اعلان کیا گیا اور مدارس کو تعلیمی نظام کا باقاعدہ حصہ بنانے کے لیے ایک قومی کمیٹی[۴۸] برائے دینی مدارس بھی قائم کی گئی۔

اس کمیٹی نے مدارس کے بارے میں ایک قومی سروے کیا اور اس کی رپورٹ ''ہالیپوتہ رپورٹ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس رپورٹ میں مدرسوں کی معاشی حالت کو بہتر بنانے اور انہیں ان کی خودمختاری برقرار رکھتے ہوئے رسمی تعلیمی نظام کا حصہ بنانے کے لیے جدید خطوط پر استوار کرنے کی تجویز دی گئی تھی[۴۹]۔ ہالیپوتہ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ مدرسوں کو غیر مشروط طور پر سرکاری مالی امداد دی جائے تاکہ ان کی معاشی حالت بہتر ہو سکے۔ اس امداد کے لیے زکوٰۃ فنڈ کو استعمال کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا[۵۰]۔ تاہم اس کمیٹی کی سفارشات کی مذہبی طبقے کی طرف سے مخالفت کی گئی اور اس سلسلے میں مکمل قانون سازی نہ کی جا سکی۔ اس کے باوجود ضیاء نے سفارشات کی مطابقت سے چند اقدامات کیے اور مدارس کو ہمنوا بنانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ حکومت نے جون ۱۹۸۰ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو ہدایات جاری کیں کہ وہ مدارس کی اسناد کو یونیورسٹی کی ڈگریوں کے مساوی قرار دینے کے لیے معیارات طے کرے۔ وفاق ہائے مدارس کی اعلیٰ اسناد کو مشروط طور پر ایم اے اسلامیات اور ایم اے عربی کے مساوی تسلیم کر لیا گیا۔

سیاسی ادوار میں اصلاحات

۱۹۸۸ء میں ضیاء دور کے خاتمے کے بعد سیاسی دور شروع ہوا اور ۱۹۹۹ء میں ایک بار پھر جنرل پرویز مشرف کی قیادت میں پرامن فوجی انقلاب سے پہلے تک بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے یکے بعد دیگرے دو دو ادوار کی شکل میں چار سیاسی حکومتیں برسر اقتدار آئیں۔ لیکن ان میں سے کسی حکومت کو خفیہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یا ظاہری فوجی مداخلت کے سبب اپنا عرصہ اقتدار مکمل کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ ۱۹۸۸ء میں بے نظیر بھٹو پہلی بار برسر اقتدار آئیں تو مذہبی انتہا پسندی کا چیلنج ان کے سامنے تھا۔ انہوں نے اس پر قابو پانے اور مذہبی طبقات کو اپنی حد میں رکھنے کے لیے سخت اقدامات کا فیصلہ کیا۔

بے نظیر بھٹو نے مدرسوں میں عرب طلبہ کے داخلے پر پابندی لگادی اور مدارس کے لیے لازم کر دیا کہ وہ غیر ملکی طلبہ سے این او سی (Non Objection Certificate) حاصل کریں۔ صوبائی زکوٰۃ کمیٹیوں کو بھی احکامات جاری کیے کہ وہ کسی مدرسے کو چھان بین کے بغیر فنڈ مہیا نہ کریں۔ اس طرح حکومت نے ان غیر ملکی حکومتوں سے بھی رابطہ کیا جن کی طرف سے مدارس کو امداد فراہم کی جاتی تھی ۵۱۔

وفاقی حکومت کی طرف سے چاروں صوبوں کو کہا گیا کہ وہ مدارس کے کام کے بارے میں رپورٹس پیش کریں۔ اس کا مقصد مدارس کی خود مختاری کو محدود کرنا اور فرقہ واریت کا خاتمہ تھا۔ مدرسوں کی اصلاح کا دعویٰ کرتے ہوئے پیپلز پارٹی حکومت کے وزیر داخلہ جنرل نصیر اللہ بابر نے مدارس کے لازمی آڈٹ، نئے نصاب اور رجسٹریشن کرنے کے لیے قانون سازی کا ارادہ ظاہر کیا ۵۲۔ لیکن عملاً یہ سب کچھ ممکن نہ ہو سکا۔

مذہبی جماعتوں کی طرف سے حکومتی اقدامات کی سخت مخالفت کی گئی اور صوبہ سرحد کے مالاکنڈ ڈویژن میں تحریک نفاذ شریعت محمدی (TNSM) نے بزور اپنے علاقے میں شریعت کے نفاذ کا اعلان کر دیا اور بعد کے سیاسی حالات بھٹو حکومت کے لیے مشکل ہوتے چلے گئے۔ ۱۹۹۶ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت کو صدر کی طرف سے برخواست کر دیا گیا۔

بھٹو کے برخلاف اگرچہ نواز شریف کی پاکستان مسلم لیگ کے تعلقات فوج کے ساتھ زیادہ اچھے تھے لیکن مذہبی فرقہ واریت کے خلاف نواز شریف نے بھی بے نظیر کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی اور ملک سے ہر قسم کی دہشت گردی کے خاتمے کا اعلان کیا اور فرقہ وارانہ انتہا پسندی میں ملوث افراد کے ساتھ سختی سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ نواز شریف حکومت نے دہشت گردی کے خلاف خصوصی عدالتیں قائم کیں تاکہ مجرموں کے خلاف جلد فیصلے کیے جاسکیں۔ اس کے نتیجے میں نواز شریف خود پر کیے گئے قاتلانہ حملے (جنوری ۱۹۹۹ء) میں بال بال بچے۔ تاہم نواز شریف کے ان اقدامات کا تعلق دہشت گردی اور فرقہ وارانہ انتہا پسندی سے تھا اور انہوں نے خود مدارس میں اصلاح کے لیے کوئی خاص کوشش نہیں کی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشرف دور میں اصلاحات

جنرل پرویز مشرف ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو ایک فوجی انقلاب کے ذریعے برسر اقتدار آئے۔ درحقیقت ان کے اور جنرل ضیاء دور میں خاصی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ ضیاء دور میں افغان جنگ اپنے عروج پر تھی اور حکومت نے اس جنگ میں امریکہ کا بھرپور ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسی طرح دہشت گردی کے خلاف ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعہ کے بعد شروع ہونے والی جنگ میں مشرف حکومت امریکہ کی اتحادی ہے۔ اور اس نے امریکی اور مغربی دباؤ پر افغانستان میں اپنی طالبان حمایت کی پالیسی پر یوٹرن لیا اور اس دباؤ کے زیراثر مذہبی انتہاپسندی سے سختی سے نمٹنے اور مدارس کے نظام میں اصلاحات کے پروگرام پر عمل درآمد کا فیصلہ کیا۔

اپنی حکومت کو دوام دینے کے لیے مشرف نے بھی ایوب اور ضیاء کی پیروی کرتے ہوئے ایک صدارتی ریفرنڈم کرایا اور بعدازاں متعدد بار حقیقی جمہوریت لانے کے لیے صدارت چھوڑنے، وردی اتارنے اور اقتدار مکمل طور پر سیاسی حکومت کے حوالے کرنے کے اپنے فیصلوں سے روگردانی کی۔ مشرف حکومت کی طرف سے کرائے گئے قومی انتخابات میں مذہبی سیاسی جماعتیں پارلیمنٹ میں ایک مضبوط قوت بن کر ابھریں اور مشرف کی طرف سے مذہبی انتہاپسندی کے خلاف کارروائی کے معاملات مزید پیچیدہ ہو گئے۔

ماڈل مدرسوں کا قیام

دینی مدارس کے نظام ونصاب میں اصلاح کے لیے حکومت نے متعدد اقدمات کیے ہیں۔ ۱۹۹۹ء میں قومی سلامتی کونسل نے ایک ورکنگ گروپ تشکیل دیا جس کا مقصد یہ تھا کہ ''وہ موجودہ مدرسوں میں بہتری کے طریقوں، مختلف مدرسوں اور سرکاری تعلیمی نظام میں مکمل رابطوں کے نظام (انضمام) کی تیاری کے لیے، مدرسوں کی خودمختاری کو متاثر کیے بغیر راہ عمل تجویز کرے'' ۵۳۔ اس ورکنگ گروپ کی سفارشات کی بنیاد پر ۲۱ مارچ ۲۰۰۱ء کو کابینہ نے کراچی، سکھر اور اسلام آباد میں ایک ایک ماڈل مدرسہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا جو باقی مدارس کے لیے مثال بن سکیں۔ ۱۸ اگست ۲۰۰۱ء کو ان ماڈل مدرسوں کے لیے ''پاکستان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مدرسہ تعلیمی بورڈ''۵۴ کے قیام کا آرڈیننس جاری کیا گیا۔ اور اس کے لیے ۳۰ ملین روپے کی گرانٹ دی گئی۔ یہ تعلیمی بورڈ ایک وفاقی اور چار صوبائی دفاتر کے ساتھ قائم کیا گیا۔

ماڈل مدرسوں کے بارے میں اس وقت کے وزیر مذہبی امور ڈاکٹر محمود احمد غازی کا کہنا تھا کہ یہ مدارس مسلکی تعصب اور تقسیم سے مبرا ہوں گے۔ طلبہ کا داخلہ یا اساتذہ کا انتخاب غیر مسلکی بنیادوں پر ہوگا اور ہم ان مدارس کو باقی مدارس کے لیے ایک مثال کے طور پر پیش کریں گے۔ ڈاکٹر غازی جن کا تعلق بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے ساتھ ہے، اپنی یونیورسٹی کو ایک جدید مدرسہ قرار دیتے ہیں۔ ۳ نومبر ۲۰۰۱ء کو مدرسہ تعلیمی بورڈ نے ماڈل مدرسوں کے لیے نصاب کو حتمی شکل دی۔ وفاق ہائے مدارس کو بھی اس بورڈ کے ساتھ الحاق کے لیے کہا جائے گا اور یہ نصاب نافذ کرنے کی سفارش کی جائے گی۔ اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ اس نصاب میں انگریزی، ریاضی، معاشرتی علوم، اور ابتدائی سائنس کی تعلیم پرائمری سے سیکنڈری کی سطح تک دی جائے گی جبکہ کمپیوٹر سائنس، معاشیات، سیاسیات، قانون اور مطالعہ پاکستان کے مضامین، انٹرمیڈیٹ اور اعلیٰ درجوں میں پڑھائے جائیں گے۔ حکومت کو توقع ہے کہ مدارس اس تبدیلی کو قبول کرتے ہوئے جدید دنیا میں قدم رکھیں گے۔ حکومت نے اس کے ساتھ بڑے اور منتخب مدارس کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کے لیے ایک فارمولہ بھی وضع کرنے کی کوشش کی جو امتحان لینے اور اسناد جاری کرنے کے مجاز ہوں۔

علماء اور حکومت کے درمیان اصل مسئلہ مدرسہ کی رجسٹریشن، مالیات اور نصاب میں براہ راست سرکاری مداخلت کا ہے۔ حکومت ایک طرف ان اقدامات کے ذریعے بیرونی دباؤ کو کم کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور دوسری طرف مدارس کے ناظمین کو بھی ناراض کرنا نہیں چاہتی جو اپنی خود مختاری کے تحفظ کے معاملے میں بے حد حساس ہیں۔

دینی مدارس: رضا کارانہ رجسٹریشن اور ریگولیشن آرڈی ننس ۲۰۰۲ء

۱۹ جون ۲۰۰۲ء کو ''دینی مدارس (رضا کارانہ) رجسٹریشن اور ریگولیشن) آرڈی ننس ۲۰۰۲ء کا ڈرافٹ عوامی بحث کے لیے جاری کیا گیا۔ اس کا مقصد مدارس کو رضا کارانہ طور پر حکومتی بورڈ کے ساتھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رجسٹریشن پر آمادہ کرنا تھا۔ بین الاقوامی اداروں کا اعتراض ہے کہ یہ رجسٹریشن رضا کارانہ نہیں بلکہ لازمی ہونی چاہیے۔ جبکہ مدارس لازمی رجسٹریشن اور مالیات کی سرکاری چھان بین کی مزاحمت کر رہے ہیں جن کے خیال میں یہ سرکاری مداخلت ان کی خودمختاری کے خلاف ہے۔

اس آرڈی ننس کے تحت کوئی نیا مدرسہ ضلعی حکام کی اجازت کے بغیر قائم نہیں کیا جا سکتا اور موجودہ مدرسوں کو رضا کارانہ طور پر مدرسہ تعلیمی بورڈ کے ساتھ رجسٹرڈ ہونا چاہیے۔ اس مجوزہ آرڈی ننس کے تحت مدارس میں فرقہ وارانہ نفرت پھیلانے اور عسکریت یا انتہا پسندی کی تعلیم دینے پر پابندی لگائی گئی ہے اور مدارس کے ناظمین کو اس حوالے سے حلف دینا ہوگا۔ جو مدارس اس آرڈی ننس کی پابندی نہیں کریں گے انہیں زکوٰۃ فنڈ سے یا کوئی بھی حکومتی امداد نہیں دی جائے گی اور ان کے خلاف دیگر کارروائی بھی کی جا سکتی ہے۔ آرڈی ننس میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ ”رجسٹرڈ مدرسے کسی غیر ملکی ذریعے سے امداد وصول نہیں کریں گے اور نہ باقاعدہ ویزہ اور وزارت داخلہ کی طرف سے این او سی کے بغیر غیر ملکی طلبہ کو داخلہ دیں گے“ ۵۵۔

یہ آرڈی ننس ابھی تک عملاً نافذ نہیں ہوا یا کچھ کمزوریوں اور ابہام کے سبب اس کے مطلوبہ نتائج نہیں نکلے ہیں۔ مشرف حکومت کی پوزیشن اس لیے نازک ہے کہ ایک طرف بیرونی ادارے اور حکومتوں اس پر مدارس کے معاملے میں سختی نہ کرنے اور علماء کی حمایت حاصل کرنے کا الزام لگاتے ہیں اور دوسری طرف مدارس حکومتی اقدامات کو شک کی نظر سے دیکھتے ہوئے اسے بیرونی دباؤ قبول کرنے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ مشرف نے رجسٹریشن کے معاملے میں اس سے بھی اتفاق کیا ہے کہ اگر مدارس تعلیمی بورڈ کے ضوابط کی پیروی کریں تو ان کی اسناد کو تسلیم کر لیا جائے گا۔

مدارس کے لیے مراعات اور سرکاری امداد

وزارت تعلیم نے مدرسوں میں نئے نصاب کو متعارف کرانے اور انہیں حکومت کے ساتھ رجسٹریشن پر آمادہ کرنے کے لیے ۱۴ بلین روپے کا پروگرام وضع کیا ہے ۵۶۔ اس پروگرام کے دو حصے ہیں۔ اول حکومت ۱۰۰۰۰ مدارس میں ۱۲۰۰ ملین روپے تقسیم کرے گی۔ تین سالوں کے لیے یک وقتی گرانٹ سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وزارت مدرسوں کو اسلامیات اور دیگر مضامین کی کتابیں مفت مہیا کرے گی اور ہر مدرسے کی لائبریری کے لیے ۱۰ الماریاں بھی فراہم کرے گی۔ دوم اس پروجیکٹ کے ذریعے جدید مضامین کے اساتذہ کی تعیناتی اور ان کی تنخواہیں، ہر مدرسے کے لیے ۵ کمپیوٹر بمع پرنٹر، اور تربیت اساتذہ کے اخراجات بھی پورے کیے جائیں گے۔ اس پروگرام کے تحت ۴۰۰۰ مدارس میں پرائمری کی سطح پر تین سال کے لیے ۱۶۰۰۰ اساتذہ بھرتی کیے جائیں گے۔ سیکنڈری تعلیم کی سطح پر حکومت ۳۰۰۰ مدارس میں ۱۲۰۰۰ اساتذہ کو تنخواہیں دے گی۔ مزید ۳۰۰۰ اساتذہ کو ۱۰۰۰ انٹرمیڈیٹ کی سطح کے مدارس میں جدید علوم کی تدریس کے لیے مقرر کیا جائے گا اور ان کے معاوضے حکومت ادا کرے گی۔ اس پروگرام سے پہلے سے موجود ۳۱۰۰۰ اساتذہ کی تربیت کا انتظام بھی کیا جائے گا۔

اصلاحات کا پیکج اور مختلف اداروں کے درمیان ذمہ داریوں کا ابہام

حکومتی اقدامات بظاہر خوش نما ہیں لیکن ابھی تک ان کے مطلوبہ نتائج نکلنا شروع نہیں ہوئے۔ درحقیقت حکومتی عزائم کے پس پشت کسی تبدیلی کی حقیقی خواہش نظر نہیں آتی بلکہ محض بیرونی دباؤ، سیاسی مصلحتوں اور وقتی ضرورتوں کا لحاظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسی طرح مدارس کے لیے مراعات کا پیکج وضع کرتے وقت بظاہر مدارس کے درمیان گروہی و مسلکی تقسیم، ان کی قوت و استعداد اور ان کے ہاں گنجائش و ضروریات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جس سے عمل درآمد میں پیش آنے والی مشکلات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مزید براں اصلاحات کے نفاذ کے لیے مختلف حکومتی اداروں اور وزارتوں کے درمیان ذمہ داریوں کا ابہام بھی پایا جاتا ہے۔ بیک وقت وزارت تعلیم، وزارت مذہبی امور، وزارت اوقاف اور وزارت داخلہ مدارس کے حوالے سے مختلف سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ کچھ مزید حکومتی نیم خود مختار ادارے (مثلاً نیشنل کمیشن فار ہیومن ڈویلپمنٹ (NCHD)) بھی اپنے طور پر اصلاحات کے نفاذ میں حصہ لے رہے ہیں اور خفیہ ایجنسیوں کی کارروائیاں اور مدارس سے رابطے اس پر مستزاد ہیں۔ کوئی مرکزی با اختیار ادارہ ایسا موجود نہیں جو ان تمام کاموں کو ہر ادارے کی ذمہ داریوں کے واضح تعین کے ساتھ باہم مربوط انداز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں آگے بڑھائے۔

رجسٹریشن اور نصاب کے معاملے میں وزارتِ تعلیم اور وزارت مذہبی امور کی ذمہ داریوں میں ابہام بھی ہے اور over laping بھی۔ محکمہ اوقاف جس کے پاس مساجد اور مدرسوں کی رجسٹریشن اور ذرائع آمدن کا ریکارڈ ہونا چاہیے، رجسٹریشن کے ان تمام معاملات سے بے خبر ہے۔ محکمہ اوقاف کے ایک افسر کے مطابق ''اصولی طور پر محکمہ اوقاف کے پاس مساجد اور مدارس کا ریکارڈ ہونا چاہیے لیکن حکومت نے یہ ذمہ داری خفیہ ایجنسیوں کو سونپ رکھی ہے''۵۷۔ درحقیقت جب تک اس ابہام اور نیم دلی کا خاتمہ نہیں کیا جائے گا اور اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ اصلاحات کا ایک مربوط پروگرام نہیں وضع کیا جائے گا، کسی حقیقی تبدیلی کی توقع بے جا ہے۔

آئندہ لائحہ عمل: غور و فکر کے چند پہلو

مدارس میں اصلاح کا لائحہ عمل طے کرتے ہوئے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ مدارس کا اصل ہدف کیا ہے؟ عموماً مدارس اس ہدف کو امامت و خطابت کی ضروریات پوری کرنے تک محدود رکھتے ہیں، اور نو آبادیاتی دور میں تیار کی گئی تحفظات کی دفاعی پالیسی کو بدلنے کے لیے تیار نہیں۔ چنانچہ پہلی ضرورت اہداف و مقاصد کے درست تعین اور ان کے بارے میں اتفاق رائے پیدا کرنے کی ہے۔ مدارس کا اصل ہدف صرف امام و خطیب پیدا کرنا نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت شخصیت کی تشکیل ہے جو زندگی کے تمام چیلنجز کا سامنا کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ اس سے قبل مسلمان علماء نے یونانی علوم و فنون پر قابل قدر کام کیا ہے جس سے مغرب آج بھی فائدہ اٹھا رہا ہے۔

اسلام کی تعلیمات زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہیں اور ایک مکمل اور جامع ضابطۂ حیات کا درس دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے عروج کے ہر دور میں زندگی کی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کو تمام عصری علوم و فنون سے روشناس کرایا جاتا رہا ہے تاکہ وہ بطور مسلمان ہر حوالے سے اپنا کردار پوری خود اعتمادی اور حسن و خوبی سے ادا کر سکیں۔

یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ پاکستان کا پورا نظام تعلیم اصلاح کا محتاج ہے جس سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاشرے میں طبقاتی تقسیم گہری ہو رہی ہے۔ مثالی اعتبار سے اس پورے نظام میں کسی مربوط پروگرام کے تحت تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ نظام تعلیم میں اصلاح کا پروگرام وضع کرتے وقت اس کا لحاظ رکھا جا سکتا ہے کہ ملک میں مختلف تعلیمی ضروریات کو جدید خطوط پر پورا کرنے کے لیے مخصوص ادارے موجود ہوں لیکن وہ سب ایک ایسے جامع نظام سے مربوط ہوں کہ ملک سے طبقاتی تفریق ختم ہو جائے اور ایک یکساں قومی سوچ اور شناخت ابھر سکے۔

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے پالیسی سیمینارز میں مدارس کے نمائندگان اور دیگر شرکاء نے مدارس کے نظام ونصاب میں تبدیلی اور اصلاح کی ضرورت سے بنیادی طور پر اتفاق کرتے ہوئے بتدریج پورے ملک میں یکساں تعلیمی نظام رائج کرنے پر زور دیا۔

اس ضمن میں ایک اہم تجویز یہ ہے کہ درسِ نظامی میں داخلے کے لیے میٹرک پاس ہونے کو لازمی شرط قرار دیا جائے۔ اس طرح مدارس پر جدید علوم سے ناواقفیت اور ان پر عدم توجہی کا الزام بھی غلط ہو جائے گا اور خود مدارس کے تعلیمی معیار میں بھی بہتری ہوگی۔ اسی طرح تربیت اساتذہ کا معاملہ توجہ کا طالب ہے۔ مدارس میں تدریس کے جدید اصولوں اور تکنیکی سہولتوں کے ذریعے تعلیم کی تربیت اساتذہ کو حاصل ہونی چاہیے۔ اس کے لیے اساتذہ کے لیے تربیتی ورکشاپس اور اورینٹیشن کورسز کا انعقاد کیا جا سکتا ہے۔ ملک کے مختلف تعلیمی اداروں کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرنے کے لیے مدارس اور ان سرکاری و پرائیویٹ اداروں میں ایک دوسرے کے طلبہ کو داخلے اور ان کی خصوصی تعلیمی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ اور سرکاری اور پرائیویٹ کالجوں میں مذہبی تعلیم کے شعبے قائم کیے جا سکتے ہیں جہاں تدریس کے لیے مدارس کے اساتذہ اور فارغ التحصیل طلبہ کی مدد حاصل کی جا سکتی ہے۔ نیز مدارس میں ہم درسی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں اضافے کے لیے سہولتیں (گراؤنڈ/کھیلوں کے سامان) وغیرہ مہیا کی جانی چاہییں۔

مدارس کے لے وسائل کا انتظام اور مالیات کی فراہمی کے ضمن میں تجویز آئی کہ نہ صرف مدارس کو باقاعدہ سرکاری گرانٹ ملنی چاہیے تاکہ اصلاحات کے عمل میں سہولت ہو بلکہ انہیں ایک ایسے خود مختار ادارے کی شکل دی جائے کہ وہ بیرونی ذرائع سے فنڈز اور امداد وصول کر سکیں جس کی شفافیت اور درست

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

استعمال کے لیے ضروری احتیاطوں کا نظام بنایا جاسکتا ہے۔

بین الاقوامی برادری خاص طور پر مغرب کے لیے اہم ہے کہ اسلام کو ایک خطرہ اور مدارس کو اس خطرے کی آماجگاہ قرار دینے سے قبل اس پر بھی غور کریں کہ کہیں ان کا یہ طرزِ عمل تہذیبی تصادم کی طرف پیش قدمی کے مترادف تو نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے کہ تو عالمی امن کا تقاضا ہے کہ اپنے سیاسی مفادات اور نظریاتی تعصبات سے بالاتر ہو کر دوسروں کے بارے میں پالیسیاں وضع کی جائیں۔ ضروری نہیں کہ سب لوگ اور اقوام ایک ہی انداز میں سوچیں اور ایک ہی نتیجے پر پہنچیں بلکہ سب کو اپنے اپنے نظریہ حیات کے مطابق دوسروں کے وجود اور حقوق کا خیال رکھتے ہوئے زندگی گزارنے کا حق ہے۔ یہ حق جتنا مغرب کو حاصل ہے اتنا ہی مسلمانوں اور مسلم ممالک کو بھی حاصل ہے۔

مسلم ممالک پر اس طرح کی سوچ اپنانے یا اس طرح کی اصلاح کے لیے بے جا سیاسی، معاشی اور فوجی دباؤ نہ ڈالا جائے جو وہاں کی مقامی اقدار اور سوچ سے ہم آہنگ نہیں۔ بصورتِ دیگر عالمی سطح پر ایک بڑی کشمکش اور تصادم کا راستہ کھل سکتا ہے۔

مدارس میں اصلاح کی اپنی من مانی توجیح کے بجائے ان کی مدد مقامی ضروریات کے مطابق وسائل کی فراہمی سے کی جائے کیونکہ سب ممالک بین الاقوامی برادری کے رکن ہیں اور زمین پر انسانی خوشحالی اور امن کے لیے ضروری ہے کہ سب کو یکساں مواقع فراہم کیے جائیں۔

چند افراد یا تنظیموں کے عسکریت پسند رجحان کو بنیاد بنا کر تمام مدارس کو دہشت گردی کے اڈے قرار دینے کی بجائے اسلامی تعلیمی نظام کا معروضی انداز میں تحقیقی مطالعہ مدارس اور اسلام کے بارے میں متوازن سوچ کو پروان چڑھا سکتا ہے۔

عالمی سیاست میں ناانصافی، ظلم، جبر، استحصال اور ترجیحی سلوک کے خلاف خود مغرب میں ایک بیداری کی مہم چلانے اور امن پسند انسانوں کی کوششوں کو مربوط بنانے کی ضرورت پر بھی غور کیا جائے۔

حواشی

1- Febe Armanios, "Islamic Relgious Schools, Madrssas: Background," CRS Report for Congress, Order Code: RS21654, Oct. 29, 2003, p.2

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

2- Joe Stephens and David B. Ottaway, "The ABC's of Jihad in Afghanistan," *The Washington Post,* March23, 2002. Sec A, p.1.

۳- امریکی ہفت روزہ ''نیوز ویک انٹرنیشنل'' کے مدیر فرید زکریا نے ایک اور امریکی جریدے ''فارن پالیسی'' میں اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ''نظریاتی دور کے بعد اس دنیا میں اعتقادی نظام کے خاتمے سے پیدا ہونے والے خلا کو ''امریکہ دشمنی'' (Anti Americanism) نے پورا کیا ہے جو بین الاقوامی پالیسی میں آج ایک طاقت ور رجحان بن چکا ہے۔ــ مثال کے طور پر ۲۰۰۰ء میں ۷۵ فیصد انڈونیشی خود کو امریکہ کے حمایتی (pro-American) کہتے تھے۔ آج ۸۰ فیصد سے زیادہ امریکہ کے خلاف ہیں''۔

(Fareed Zakria, "The Worlds Most Dangerious Ideas," *Foreign Policy,* Sep-Oct. 2004)

۴- یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ ''امریکہ دشمنی'' عالمی اندازوں کے مطابق ایک بڑھتا ہوا رجحان ہے جس کا سبب محض نظریاتی اور مذہبی حوالوں سے ہی نہیں بلکہ عالمی سیاست، بین الاقوامی تعلقات، قومی مفادات، عالمی توازن طاقت کے حوالوں سے بھی تلاش کیا جانا چاہیے۔ صرف مسلمانوں اور مدارس میں ہی نہیں بلکہ یورپ اور غیر اسلامی دنیا کے اکثر ممالک کے بیشتر عوام میں امریکہ مخالفت کے جذبات موجود ہیں۔ فرید زکریا کے بقول صرف دو ممالک اسرائیل اور برطانیہ کے علاوہ دنیا کے کسی ملک میں پائیدار اکثریت امریکہ کی حمایتی نہیں۔ (فرید زکریا، ایضاً)

۵- ''یوں --- مدارس کا نظام لاکھوں اسلامی عسکریت پسند پیدا کرنے کی نرسری بن چکا ہے جنھوں نے دنیا میں تنازعات کو پھیلا دیا ہے۔ فلپائن، انڈونیشیا، روس، وسطی ایشیا اور نیویارک کے عالمی تجارتی مراکز میں ہونے والے [دہشت گردی کے] واقعات کا تعلق مدرسوں کے گریجوایٹس کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔--- یقیناً پاکستان دہشت گردی کے لیے زرخیز باغ ہے''۔ (Ben Barber, "Pakistan's, Jihad Factories," *The World & I,* Dec 2001. p.68)

۶- ''بنیادی اسلامی تعلیمات سے آگے بڑھ کر کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انتہا پسند مدرسوں کا ایک مختصر گروپ، وہ مدارس جو خاص طور پر افغانستان پاکستان سرحد پر واقع ہیں، اسلام کی عسکری شکل کو فروغ دے رہے ہیں اور مسلمانوں کو کافروں کے ساتھ لڑنے اور مغرب کے اخلاقی انحطاط کے خلاف کھڑے ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔ دیگر مبصرین کا خیال ہے کہ ان مدارس کا مذہبی تعلیم اور تخصص سے کوئی واسطہ نہیں اور یہ صرف تشدد کی تعلیم دینے پر توجہ مرکوز کرتے ہیں''۔ (CRS رپورٹ بحوالہ بالا، ص ۳)

7- Jessica Stern, "Pakistan's, Jihad Culture," *Foreign Affairs,* Nov/Dec 2000.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

8- ICG Asia Report No. 36, "Pakistan: Madrasas, Extremism and the Military," July 29, 2002, p.1.

۹۔''ان مذہبی نظریاتی مطالبات کے مقابل ایک ایسے متبادل نظریے اور سوچ (وژن) کی شناخت کی جائے جو ایک مراکشی کے الفاظ میں 'قومی شناخت، روایت اور جدیدیت کو یکجا کر کے پیش کرے اور جو معاشرے میں خدا کا جائز مقام بھی واپس دلائے۔ اس کے خیال میں اسلامی دنیا اتنی خاموش، اتنی جھجک رکھنے والی اور اتنی مفلوج ہے کہ [خود] یہ کام کر سکے کیونکہ ان کا مسئلہ مذہب ہے لیکن آخر خدا ہماری حمایت میں کیوں نہیں ہے؟''۔
(Greg Mills, "War on terror begins in Pakistan's Schools," *The Sunday Independent,* (South Africa's Quality Sunday Newspaper), July 25, 2004).

۱۰۔ اشارات، ترجمان القرآن، لاہور: جون ۲۰۰۴ء

11- USAID Issue paper no-2, "Strengthening Education in the Muslim World", June 2003.

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ بش انتظامیہ نے مالی سال ۲۰۰۴ء (FY2004) میں پاکستان میں اکنامک سپورٹ فنڈ (ESF) کے لیے ۲۰۰ ملین ڈالر کی درخواست کی تھی جس میں سے تعلیمی پروگرام کے اخراجات پورے کیے جائیں گے۔

14- "The Middle East Partnership Initiative Programming guide", USAID/ Asia and Near East Bureau and Department of State/Near East Affairs, June 2003.

15- CRS Report for Congress, Order code RS 21654, Oct 29, 2003, p.6.

۱۶۔ انٹرنیشنل کرائسس گروپ'' ایک پرائیویٹ بین الاقوامی ادارہ ہے جو دنیا بھر میں جاری تنازعات پر تحقیقی رپورٹس شائع کرتا ہے اور اپنی سفارشات پیش کرتا ہے۔ اس کے چیئرمین فن لینڈ کے سابق صدر Martti Ahtisaari ہیں اور جنوری ۲۰۰۰ء سے اس کے صدر اور چیف ایگزیکٹو سابق آسٹریلین وزیر خارجہ Gareth Evans ہیں۔ اس کا مرکزی دفتر (ہیڈکوارٹر) برسلز میں ہے جبکہ ایڈووکیسی آفسز واشنگٹن ڈی سی، نیویارک اور پیرس میں ہیں اور رابطہ دفتر لندن میں ہے۔ چار براعظموں میں پھیلے تقریباً ۳۰ ممالک میں جہاں کوئی تنازعہ چل رہا ہو اس کے گیارہ دفاتر کام کرتے ہیں۔ اس ادارے کو مغربی حکومتیں، بین الاقوامی امدادی ادارے، ملٹی نیشنل کمپنیاں وسائل فراہم کرتی ہیں۔ اسے وسائل فراہم کرنے والے ممالک میں آسٹریلیا، کینیڈا، ڈنمارک، فن لینڈ، فرانس، جرمنی، آئرلینڈ، لکسمبرگ، نیدرلینڈ، ناروے، چین (تائیوان)، سویڈن، سوئٹزرلینڈ اور برطانیہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بڑے بڑے ادارے اور انجمنیں جو انہیں امداد دیتی ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

The Atlantic Philanthropies, Bill and Melinda Gates Foundation, Carnegie Corporation of New York, Ford Foundation, John D and Catherina T. Mac Arther Foundation, John Merck Fund, Open Society Institute etc.etc.

17-ICG Asia Report No. 36. op.sit.

18- "The hold of religious power, the unjust traditional order of feudal society and the numbness of thought are a few ideas which will serve to characterise the European Middle Ages". (Tariq Ramadan, *Islam, the West and the Challenge of Modernity,* The Islamic Foundation, Liecester, U.K., 2001, p.3)

19- "After Karl Marx, Charles Darwin. Sigmund Freud, and Friedrich Nietzsche religion was religated to the realim of myth, legend, superstition-- something for the less than intelligent -- to fade away as humanity progresses in its successful quest to unravel the last mysteries of our existence. By the end of the 19th Century, Nitzsche was able to declare God dead'. (Dr. Murad Wilfried Hofmann, *Modren Islamic Polity in the Making*, Institute of Policy Studies, Islamabad, 2001, p.18.

نوٹ: مگر یاد رہے کہ گزشتہ صدی سے مغرب میں دوبارہ مذہب کے مردے میں جان پڑنا شروع ہو چکی ہے۔ روایات سے منقطع رشتہ اور روحانی پیاس مغربی انسان کو مختلف عقائد و نظریات اور مذاہب میں دلچسپی لینے پر مجبور کر رہی ہے۔ وہاں سینکڑوں نئے دین ایجاد ہو چکے ہیں۔ مذہب کا احیاء خود مشرق سے زیادہ مغرب میں نمایاں ہے۔ دیگر مذاہب میں دلچسپی سے قطع نظر بعض تازہ جائزوں کے مطابق اسلام یورپ اور امریکہ میں سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن چکا ہے۔

20- Abul Hasan Ali Nadvi, *Speaking Plainly to the West,* Acadamy of Islamic Research and Publications, Nadwatul-Ulama, Lucknow, India, 1976 (2nd Eng-Edition), p.1.

21- Ibid, p.2

22- Sumuel P. Huntington, "The Clash of Civilizations?", *Foreign Affairs,* Summer 1993.

23- Rod Dreher, "Religions role is Central to this Conflict", *The Dallas Morning News,* August 3, 2004.

۲۴- کراچی میں آئی پی ایس کے سیمینار ''دینی مدارس: قومی پالیسی کی تشکیل نو'' (۲۹ جولائی ۲۰۰۴ء) میں گفتگو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۵-لاہور میں آئی پی ایس کے سیمینار ''تحقیق وصحافت میں دینی مدارس کا کردار'' (۲۱ جولائی ۲۰۰۴ء) میں مقالہ۔

۲۶-اسلام آباد میں آئی پی ایس کا سیمینار ''دینی مدارس: موجودہ صورت حال، آئندہ لائحہ عمل'' (۶ مئی ۲۰۰۴ء)

27- Munir Ahmad, "Islamic Education Prior to the Establishment of Madrasa", *Journal of Islamic Studies*, 1987.

28- "Theocracy stood for divine rule through an ecclesiastical class whose word became the law, undisputed and indisputable. In Islam, thre is no priestly class. Allah is the sovereign. His will is clearly avialable in the form of the Quran and the Sunna. The Sharia is a known quantity, available to all and not a divine secret known only to the priesthood. In Islam. there is no possibility of any group of people imposing their personal will or preferences over others in the name of God. It is through an open process of debate and discussion that the law is developed and implemented". (Khurshid Ahmed, "Islam and Democracy: Some Conceptual and Contemporary Dimensions", *The Muslim World,* Vol. 90, No 1 & 2, Spring 2000, Hartford,C T, USA, p 14-15.

29- Munir Ahmad, "Islamic Education Prior to the Establishment of Madrasa", *Journal of Islamic Studies*, 1987 (Reffered by Uzma Anzar in her draft paper: Islamic Education: A Brief History of Madrassas with Comments on Curricula and Current Pedagogical Practices, March 2003.

30- www.islamicweb.com

۳۱-عالم اسلام کے عظیم مفکر علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے اپنی شہرہ آفاق ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' میں اس مسئلے پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور بطور خاص اجتہاد کے اصولوں کی روشنی میں فقہ اسلامی کی تدوین نو کرنے والے کو دورِ جدید کا مجدد قرار دیا ہے۔

32- Uzma Anzar, "Islamic Education: A Brief History of Madrassas with Comments on Curricula and Current Pedagogical Practices", March 2003 (draft).

۳۳-مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش''، مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی ۱۹۷۶ء، چوتھا ایڈیشن، ص ۸۶۔

۳۴-مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی، ''سوانح قاسمی'' حصہ دوم، ص ۲۲۳-۲۲۴۔ (مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی)

۳۵-مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، بحوالہ بالا، ص ۸۹۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۶- آئی پی ایس سیمینار ''پاکستان میں دینی مدارس: موجودہ صورت حال اور آئندہ لائحہ عمل'' اسلام آباد، ۶ مئی ۲۰۰۴ء

۳۷- مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، بحوالہ بالا ص ۹۱

۳۸- تہذیب الاخلاق، مضامین سرسید، جلد دوم، ص ۱ (بحوالہ سیّد ابوالحسن علی ندوی، ص ۹۰)

39- Nazir Ahmad, 1956 Survey quoted by Jamal Malik, *Colonialisatoin of Islam: Dissolution of Traditional Institution in Pakistan* (Lahore 1996), p.180.

40- Muhammad Qasim Zaman, "Religious Education and the Rhetoric of Reform: The Madrasa in British India and Pakistan", 1999 Society for Comparitive Study of Society and History, P. 310.

41- Mumtaz Ahmad, "Madrassa Education in Pakistan and Bangladesh".

42- ICG Asia Report No. 36, "Pakistan: Madrassas, Extremism and the Military, 29 July 2002, p. 2.

43- Jamal Malik, op.cit. 60.

۴۴- ان میں وفاق المدارس العربیہ (سنی دیوبندی)، تنظیم المدارس العربیہ (سنی، بریلوی)، وفاق المدارس الشیعہ (شیعہ) اور وفاق المدارس السّلفیہ (اہل حدیث/سلفی) شامل ہیں۔ تقریباً ۹۵ فیصد رجسٹرڈ مدارس ان وفاقوں کے ساتھ ملحق ہیں، جماعت اسلامی کے زیر اہتمام رابطۃ المدارس ۱۹۸۳ء میں قائم ہوا تھا۔

45- 178 Colleges and 3,693 Schools in the Private sector, including missionary institutions, were nationalized. See Muhammad Waseem, *Politics and the State in Pakistan*, National Institute of Historical and Cultural Research, Islamabad, 1994, p.301

46-ICG Asia Report, p.8.

47- Muhammad Waseem, op.cit. p. 387.

48- The Ministry of Religious Affairs' handout of January 17, 1979, quoted by Jamal Malik, op.cit. p.132.

49- Committee's Chairman Dr. A.W.J Halepota had also been associated with Ayub Khan's Commission for Madrassa reform in the 1960, (Jamal Malik, op.cit, pp. 133-134, 139.

50- Ibid, p. 135.

51- Nasir Malik, "Financial Squeeze to Discipline Madrasa", *Dawn*, January 23, 1995, p.1.

© rasailojaraid.com